www.urducouncil.nic.in
قیمت: ₹10/-

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جنوری 2020

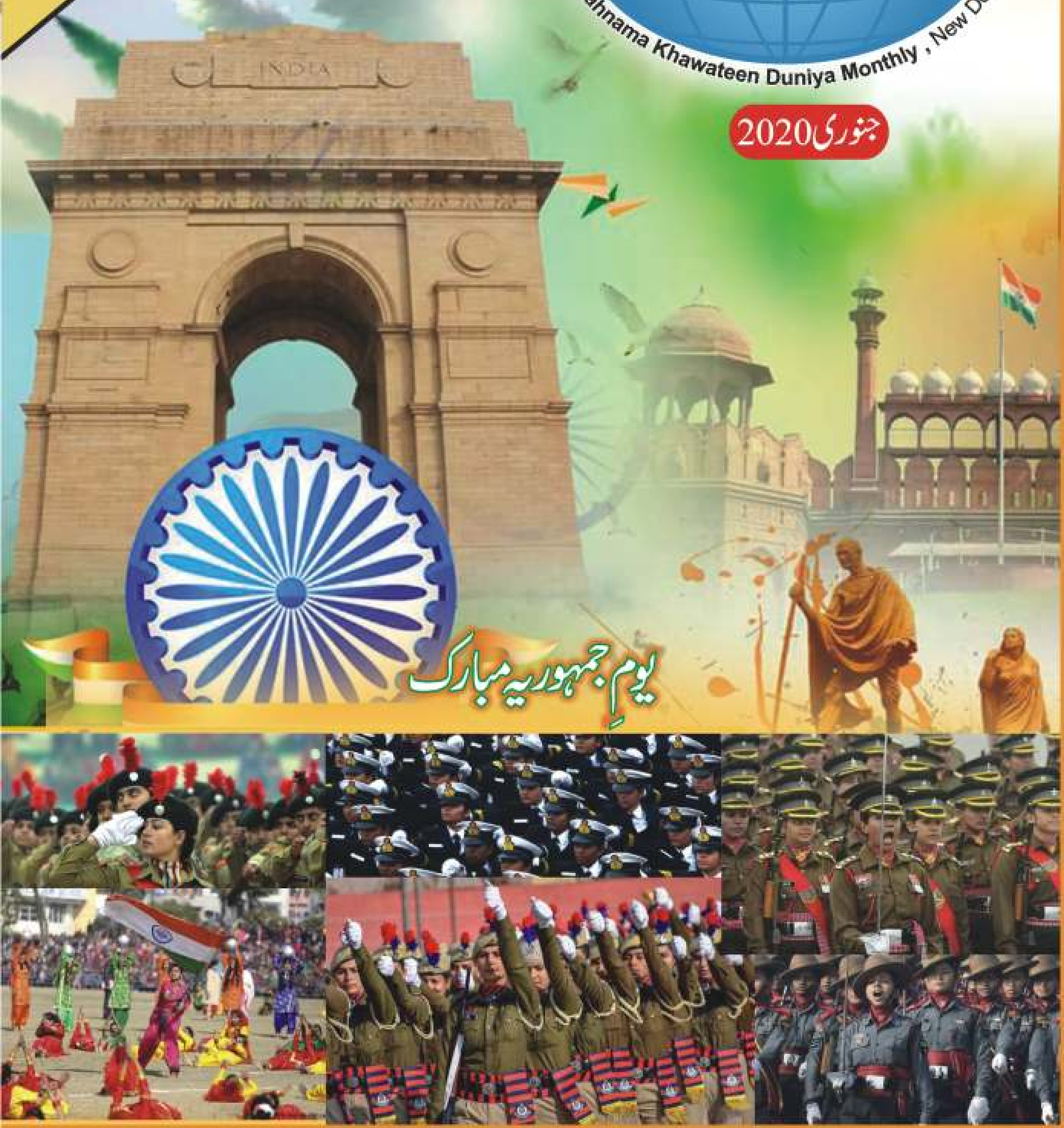

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

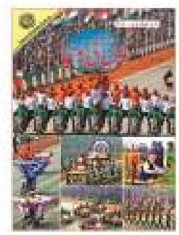

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

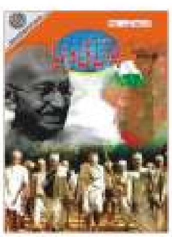

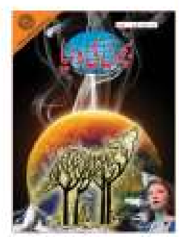

سب سے زیاہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 040 - 24415194

اردو کی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 4 شمارہ: 1 جنوری 2020

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، چھتہ گلی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ			4
شخصیت	اردو نشریات کا ایک اہم نام: سعیدہ بانو	ڈاکٹر شکیل اختر	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		10
جہان نسواں	اردو میں غدر 1857 سے متعلق تاریخیں	ڈاکٹر شہناز بیگم	11
	جاوید ناصر خاں	ڈاکٹر شاہین فاطمہ	18
	ننھے دماغوں کو زنگ آلود ہونے سے بچائیں	ڈاکٹر محمد فیروز عالم	20
	شمیم نکہت کے خاکوں کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر عرشیہ جبین	22
	ادب کی خواتین نوبیل انعام یافتگان	نثار حسن	28
	سوشل میڈیا اور طلبہ کی جسمانی و ذہنی صحت	مومن سمیہ	33
	صالحہ عابد حسین کے افسانوں میں سماجی و طبقاتی شعور	صوفیہ محمود	37
کہانیاں	پہلا بچہ	ڈاکٹر حنا شائم	41
	اندھیرا اجالا	رخسانہ نازنین	43
	امی	زائرا حسینی	46
حسن سخن	ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا، سائرہ عظیم، ڈاکٹر مسرور صغریٰ		49
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		51
صحت	توانائی اور طبی افادیت سے بھرپور مختلف ذائقہ دار پھل	محمد طاہر صدیقی	53
آرائش و زیبائش	شہد کے 10 ناقابل یقین فوائد		57
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		59
خواتین خبرنامہ			61

مشعل

عورتوں میں فطرت نے کچھ خاص جذبات واحساسات پیدا کیے ہیں۔اس حوالے سے خواتین میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ بیداری آئی ہے۔

رپورٹوں کے مطابق جدید معاشرے میں علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر دنیا بھر میں زچگی کو لے کر خواتین کی شرح اموات میں کافی کمی آئی ہے۔اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ پچیس برسوں میں حمل سے وابستہ وجوہات کے باعث ہونے والی اموات میں 50 فیصد تک کمی آئی ہے۔طبی جریدے لانسٹ میں شائع ہونے والی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سال 2015 میں تین لاکھ تین ہزار خواتین دوران حمل یا زچگی کے بعد چھ ہفتوں کے دوران ہونے والی پیچیدگیوں کے باعث ہلاک ہوئیں جبکہ 1990 میں یہی تعداد پانچ لاکھ 32 ہزار تھی۔

قدیم زمانہ میں آج کی طرح جدید ٹیکنالوجی کا کوئی وجود نہ تھا۔اس وقت گھروں میں بچوں کی نارمل ڈلیوری عام بات تھی۔اس زمانہ میں مائیں تعلیم یافتہ بھی نہیں ہوتی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی صحت کا خیال ہر لحاظ سے رکھتی تھیں۔آج جدید ٹیکنالوجی بھی میسر ہے لیکن اس کے باوجود بچے کی پیدائش آپریشن کے ذریعے ہونا عام بات ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آج کی خواتین کا جو رہن سہن اور غذا ہے وہ قدیم زمانے کی خواتین سے بہت حد تک مختلف ہے۔کچھ خواتین حمل کے دوران احتیاط سے کام لیتی ہیں نتیجتاً ان کو ڈلیوری کے وقت کم دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عورتوں اور نوزائیدہ بچوں میں ولادت کے دوران یا پیدائش کے فوری بعد اموات کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ان میں بھی زیادہ تر بچے ایک سال کے دوران ہی موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔اگر پیدائش کے دوران پیچیدگیاں بڑھ جائیں یا پھر بچوں میں پیدائشی نقائص ہوں،معدے میں انفیکشن ہو جائے تو پھر بچوں کی پیدائش کے پہلے مہینے ہی میں مرنے کے زیادہ خطرات ہوتے ہیں۔پوری دنیا میں بچوں کی پیدائش کو زندگی کی بڑی خوشیوں میں سے ایک خوشی تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود دنیا بھر میں 11 سیکنڈ میں ایک بچے کی موت متاثرہ خاندان کے لیے کسی سانحے سے کم نہیں ہوتی ہے۔یونیسیف کے ایگزیکیٹو ڈائرکٹر ہین ریٹا فور کا کہنا ہے کہ پیدائش کے وقت ماؤں اور نوزائیدہ بچوں کی مدد کے لیے تربیت یافتہ عملہ،صاف پانی،مناسب غذا اور بنیادی ادویات کی کمی موت کا سبب بنتی ہے۔ان کا کہنا تھا کہ قیمتی جانوں کو بچانے کے لیے ہمیں ان تمام بنیادی باتوں کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔

حمل کے دوران خواتین کے جسم میں کچھ نئی تبدیلیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ان تبدیلیوں کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے۔خواتین میں یہ تبدیلیاں یوں ہی نہیں ہوتیں بلکہ ان تبدیلیوں کے ہونے میں بھی بہت سی وجوہات کارفرما ہوتی ہیں۔خواتین کو اس ضمن میں توجہ دینا ضروری ہے۔اگر وقت رہتے ان باتوں کا خیال نہیں رکھا جائے تو اس سے کئی بیماریوں کے پیدا ہونے کا خطرہ بھی ایک حد تک بڑھ جاتا ہے۔خواتین کو چاہیے کہ اس کیفیت میں احتیاط سے کام لیں اور دوران حمل انھیں کن باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے اس سلسلے میں وہ اپنے ڈاکٹر کی زیر نگرانی رہیں اور وقتاً فوقتاً ڈاکٹر سے رابطہ رکھیں۔اپنی صحت کا خیال رکھیں اور ڈاکٹر کے مشوروں کے مطابق روزمرہ کے کام کاج اور ورزش کرتی رہیں۔بعض گاؤں اور دیہاتوں میں اس سلسلے میں صحت کیمپوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ خواتین اپنی صحت کے تئیں بیدار رہیں اور اپنی صحت اور بچے کا خیال رکھ سکیں۔

'خواتین دنیا' خواتین کا اپنا رسالہ ہے، ہماری کوشش ہے کہ ہم اس رسالے کے ذریعے خواتین میں تعلیم وتربیت کے تئیں بیداری لائیں۔ساتھ ہی ان کی زندگی کے متعلق مختلف موضوعات اور مسائل پر بھی وقتاً فوقتاً جانکاریاں فراہم کرتے رہیں۔اس شمارے میں ہم نے عورتوں کو حمل کے دوران ہونے والی پریشانیوں پر مبنی ایک سچی کہانی دی ہے جو امراض نسواں کی ماہر ڈاکٹر حنا شمائم نے خصوصی طور سے ہمارے رسالے کے لیے تحریر کی ہے۔آپ سب اس رسالے کو پڑھیں اور اپنی قیمتی رائے سے نوازیں۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شکیل اختر

اردو نشریات کا ایک اہم نام

سعیدہ بانو

ہندوستان کی تہذیبی اور معاشرتی تاریخ میں عورتوں کی جس زبوں حالی اور استحصال کو دکھایا گیا ہے، دراصل وہ ہمارے مرد اساس معاشرے کی منفی فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ صرف ہندوستان کی ہی صورت حال نہیں ہے بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں بھی خواتین کو دوسرے درجے کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ دنیا کے مختلف مذاہب نے عورتوں کو عزت بخشی لیکن اس اعزاز اور قدر و منزلت پر ہمارے مرد اساس تہذیبی اور ثقافتی رشتے اس قدر حاوی رہے کہ اس کی اصل روح مجروح ہوگئی۔

دنیا میں جب مختلف نوع تحریکات کا آغاز ہوا، نشاۃ ثانیہ کا دور آیا، صنعتی انقلاب نے اتھل پتھل کی تو خواتین کی اس حالت زار میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور عورتوں کے حق میں آوازیں اٹھنے لگیں۔ لیکن صدیوں کی ستائی ہوئی عورت کے اندر ظلم سہنے کی وجہ سے ایک نفسیات پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے اس نے ہمیشہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھا اور معاشرتی طور پر اسے مظلوم دکھایا بھی گیا۔ لیکن جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا اور علم کی شمعیں روشن ہونے لگیں تو خواتین کی دنیا کی تاریکی بھی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی۔ لیکن خواتین کو مظلومیت کی اس ردا کو تار تار کرنے میں ایک زمانہ لگ گیا اور آج بھی صد فیصد تبدیلی نہیں آئی ہے اور یہ جدوجہد جاری ہے۔ 21ویں صدی نے جب دستک دی تو پوری دنیا میں اور بالخصوص مغربی ممالک میں خواتین کی ترقی کا گراف کافی اوپر جا چکا تھا لیکن ہندوستان یا برصغیر کی عورتوں میں یہ گراف بہت زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم جب یوم خواتین مناتے ہیں اور عورتوں کو بااختیار بنانے کی بات کرتے ہیں تو شاید ان مزدور عورتوں کو بھول جاتے ہیں جو آج بھی جابر ٹھیکہ داروں کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہو رہی ہیں۔ لیکن اسی شب و روز میں خواتین نے خود کو سماج سے نبرد آزما کیا اور اپنے معاشرے اور فرسودہ قوانین کی قطعی پرواہ نہیں کی۔ ہندوستان میں انیسویں صدی کا مسلم معاشرہ جاگیردارانہ نظام میں جکڑا ہوا تھا۔ بعض گھرانوں میں تعلیم تو تھی لیکن عورتوں پر آزادیٔ اظہار کی پابندی تھی۔ اردو کی مشہور نثر کار سعیدہ بانو نے اس زمانے کے لکھنؤ کے مضافات کی زندگی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

''مردوں کی بنائی ہوئی دنیا میں عورتوں کو جاہل رکھنے میں بڑے فائدے تھے۔ اپنی مرضی کے مطابق اپنے لیے مردوں نے سب کچھ مہیا کر لیا تھا۔ نوکر چاکر ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تو مردوں ہی مردوں کا ہے، سنجیدہ مشاغل بھی ہیں۔ مشاعرے، ادبی محفلیں، مناظرے، مصوری، خطاطی، تفریح طبع کے لیے شطرنج، گنجفہ، پچیسی، تاش، جوا، مے خواری بھی ہو جائے تو نظر انداز کر دو۔ طوائفوں کا مجرا رات بھر ہو، ادھر عورت چہار دیواری میں، رشتہ دار عورتوں سے گھری ہوئی، کڑھائی بنائی، زردوزی کا کام، چکن کے کام میں مغلیہ کھانا بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ ایک سے ایک مزیدار ہانڈیاں بن رہی ہیں۔ مردانے میں پکا کر پہنچائی جا رہی ہیں۔ فلاں کی بیگم فلاں کی بیٹی غضب کا گیلانی خشکہ پکاتی ہیں۔ موتی پلاؤ ایسا ہوتا کہ انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ اور انڈوں کا حلوہ اف اف، کچی بریانی کا تو بس ذکر ہی نہ کرو۔ ان کھوکھلی باتوں پر معاشرت کی ایسی بنیاد رکھی گئی تھی کہ عورتیں دم نہیں مار سکتی

تھیں۔ اشارتاً بھی اس شکایت کا امکان نہیں تھا کہ ہم عورتیں زنانے میں قید ہیں اور باہر یہ رنگ رلیاں، عورتیں پوری طرح مرد کی دست نگر تھیں۔ سر اٹھانے کے راستے بند تھے۔ ناانصافی کے ان حالات سے وہ مصالحت کر چکی تھیں۔''

(بحوالہ ڈگر سے ہٹ کر: از سعیدہ بانو احمد، صفحہ 9 تا 10)

ایسے ہی فرسودہ اور مرد اساس معاشرے سے ہماری عورتیں نبرد آزما تھیں لیکن بہت جلد ہی خواتین نے اس حصار کو توڑ کر دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کی طرف خود کو گامزن کیا مختلف شعبوں کے ساتھ ہندوستان میں نشریات کی جانب بھی اردو داں مسلم خواتین نے توجہ دی اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہندوستان میں ریڈیو نشریات کا آغاز باقاعدگی سے 1936 میں ہوا۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے کی سماجی اور تعلیمی صورت حال پر نظر ڈالیں تو ملک کئی اہم تعلیمی اور سماجی تحریکات سے گزر چکا تھا۔ فرنگیوں کی حکومت میں تعلیم کو خوب فروغ دیا گیا لیکن خواتین کی تعلیم اور بہبود کی کسی پالیسی کا ذکر نہیں ملتا۔ اس طرح کی توقع کسی اور سے کرنا کار عبث کے سوا اور کیا ہوگا۔ یہاں تک کہ سرسید کے ابتدائی تعلیمی افکار میں خواتین کا گزر نہیں تھا۔ خدا بھلا کرے اور غریق رحمت کرے عبداللہ کا جنھوں نے علی گڑھ کی سرزمین پر خواتین کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔ گویا یہ دور بھی خواتین کی زبوں حالی کا تھا اور ایسے وقت میں خواتین کی شمولیت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ابتدائی دور میں خواتین کی رسائی ریڈیو تک نہیں تھی اور یہاں بھی مرد اساس معاشرے کا بھرپور اثر نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نشریات نہایت حساس نوع کا کام ہے اس میں اعتماد کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کی ابتدائی نشریات اور شوقیہ نشریات کے دور میں خواتین کا ذکر نہیں ملتا، لیکن بہت جلد ہی یہ فسوں ٹوٹا اور خواتین نہ صرف گھروں میں ریڈیو سنتی رہیں بلکہ ریڈیو اسٹیشن آکر پروگراموں میں حصہ لینے لگیں۔

دہلی اسٹیشن پر تادم تحریر جس خاتون نے پہلی بار ریڈیو ٹاک پڑھی ان کا نام لیلیٰ تھا۔ وہ مشہور انشاپرداز اور مصور فطرت خواجہ حسن نظامی کی بیوی تھیں۔ ویسے تو خواجہ صاحب ابتدا ہی سے ریڈیو نشریات میں شرکت کرنے لگے تھے اور ان کی ہمت افزائی سے بیوی نے بھی ریڈیو کے لیے ٹاک لکھنے کا سلسلہ شروع کیا اور حسن اتفاق کہیں کہ انھوں نے ریڈیو پر ایک ایسی ٹاک پڑھی جس کا موضوع تھا ''ریڈیو سے عورتوں کو کیا فائدے ہیں''۔ اس کے بعد دہلی اور لکھنؤ ریڈیو پر اردو بولنے والی خواتین نے پے در پے فرسودہ سماج کے رسم و رواج سے بغاوت کی اور نشریات میں شامل ہو گئیں اور دیکھتے دیکھتے ایک قافلہ بن گیا اور سالار قافلہ سعیدہ بانو بنیں کیونکہ یہ پہلی مسلم اردو داں خاتون تھیں جنھوں نے باقاعدہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کی اور اردو سروس سے بحیثیت پروڈیوسر سبکدوش ہوئیں۔

نشریات میں سعیدہ احمد کی جدوجہد سے قبل آیئے ایک نظر ان خواتین پر ڈالتے ہیں جنھوں نے مختلف ریڈیو اسٹیشن پر بلاواسطہ اور بالواسطہ کام کیا اور اردو نشریات کے گیسو سنوارے۔ سحاب قزلباش یہ دہلی ریڈیو پر اناؤنسر تھیں اور دہلی کی مشہور شاعرہ بھی تھیں۔ تسنیم فضل آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں پروڈیوسر تھیں۔ نور جہاں ثروت نے بھی کچھ دنوں تک آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اسکرپٹ رائٹر کے طور پر کام کیا۔ سلطانہ بیگم آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں پروگرام اسسٹنٹ تھیں۔ یہی بعد میں سلطانہ جعفری بن گئیں۔ ان کے علاوہ وہاں صوفیہ تنڑا جن، بیگم شوکت اور بیگم ذکیہ بھی اردو نشریات سے وابستہ تھیں۔ بقول رفعت سروش امریتا پریتم بھی ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ تھیں۔ ان کے علاوہ رضیہ سجاد ظہیر، طاہرہ حسن، فرح جعفر، سعید انصاری کی بیٹی ذکیہ انصاری کی وابستگی بھی ریڈیو سے تھی۔ صغرا مہدی نے آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اردو مجلس میں بحیثیت اسکرپٹ رائٹر ایک برس تک کام کیا۔

ان تمام خواتین میں سب سے نمایاں نام سعیدہ بانو کا ہے جو لکھنؤ کی قصباتی زندگی کی پروردہ تھیں جہاں پردے کا نظام بھی تھا اور عورتوں کو عموماً گھر سے باہر جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ ایسے ماحول میں کسی خاتون کا گھر سے نکلنا اور دہلی ریڈیو میں نوکری کرنا ایک بڑی بات تھی۔ 2/ اپریل 1938 کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت سعیدہ کی شادی ہو چکی تھی اور لکھنؤ کے پاس ردولی میں رہتی تھیں۔ ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ لکھنؤ کی فضاؤں میں ریڈیو کی لہروں نے دستک دی تھی۔ اس وقت کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی خودنوشت میں لکھتی ہیں کہ:

''غالباً 1938 میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کا وجود عمل میں آیا۔ ہم لوگ شوق سے ریڈیو کے پروگرام سنتے تھے۔ عورتوں اور بچوں کے پروگرام بھی نشر ہونے لگے اور اکثر خواتین کے نام سننے میں آئے جو کسی موضوع پر تقریر کرتیں یا ڈراما وغیرہ میں شریک ہوتیں۔ اب سننے والی عورتوں کا دل چاہتا کہ ہماری آواز بھی ریڈیو پر سنی جائے۔ ساتھ ہی یہ محسوس ہوتا کہ ایسا تو ناممکن ہے۔ ریڈیو پر تو طوائفیں جاتی ہیں اور طوائفوں سے شریف گھرانے کی عورتیں پردہ کرتی ہیں۔ آہستہ آہستہ ریڈیو کے افسران تک یہ خبر پہنچی کہ لکھنؤ کے قدامت پسند

خاندانوں میں طوائفوں سے پردہ کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں سے بیبیوں کا ریڈیو میں آنا ممکن ہی نہیں۔ ریڈیو میں ضرورت تھی پڑھی لکھی عورتوں کی جو بحث میں حصہ لیں۔''

(بحوالہ ڈگر سے ہٹ کر۔ ص97)

اس بات کی بھنک جب ریڈیو اسٹیشن کے افسران کو ملی تو انھوں نے فوراً فیصلہ کیا کہ شرفا کے گھرانوں تک یہ اطلاع پہنچائی جائے کہ آپ جیسا سوچتے ہیں ویسا نہیں ہے۔ ریڈیو میں طوائفوں کے آنے جانے کے راستے الگ ہوتے ہیں اور خواتین برقع میں بھی آسکتی ہیں۔ لہٰذا سعیدہ بانو بھی اپنے شوہر کی منظوری سے ایک مباحثے میں شرکت کے لیے ریڈیو لکھنؤ گئیں۔ یوں دیکھتے دیکھتے سعیدہ بانو لکھنؤ کے روایتی معاشرے سے بغاوت کرتے ہوئے ہوا کے دوش پر سامعین سے مخاطب ہونے لگیں۔ ان کا اندازِ گفتگو اور مسحور کن آواز نے ریڈیو کے احباب کو بھی مسحور کر دیا اور انھیں بحیثیت پروگرام کمپیئر بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب سعیدہ ریڈیو کی باقاعدہ کمپیئر بن گئیں اور ہفتے میں ایک دو بار ریڈیو جاتیں اور بچوں یا خواتین کے پروگرام کی کمپیئرنگ کرتیں۔ بہت ہی کم مدت میں انھوں نے اپنی کمپیئرنگ کا سحر جگادیا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ سعیدہ اس زمانے میں ردولی سے کار خود ڈرائیو کر کے لکھنؤ اسٹیشن آتیں اور کبھی انھوں نے اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ معاشرہ کیا کہے گا۔ لکھنؤ اسٹیشن پر وہ اردو پروگرام حسیب احمد اور جگل کشور کی رہنمائی میں کر رہی تھیں۔ فرسودہ معاشرے میں سانس لیتے ہوئے انھیں اپنے گھریلو مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ان کی گھریلو زندگی مختلف نشیب و فراز اور ناچاقیوں کے مابین گزرتی رہی۔ اسی دوران انھوں نے برٹش براڈکاسٹنگ سروس لندن میں ملازمت کے لیے درخواست بھیج دی لیکن مرد اساس معاشرے نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ایک خاتون اتنی دور ریڈیو میں تنہا جائے اور نوکری کرے۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

''میں نے بی بی سی کے لیے درخواست لندن بھیجی تھی۔ Disc پر میری آواز بھی گئی تھی اور کچھ عرصے بعد بی بی سی سے میرے نام ایک خط بھی آیا تھا جس میں ملازمت کی درخواست کو منظور کرلیا گیا تھا اور مجھ سے وہاں جوائن کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔'' (بحوالہ ڈگر سے ہٹ کر، صفحہ 126)

لیکن ان کے عزیز شوہر کو یہ بات ناگوار گزری اور خود سعیدہ بن کر بی بی سی والوں کو خط لکھ دیا کہ میں اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر نوکری نہیں کرسکتی۔ لہٰذا اردو کی اس خاتون کی پہلی کوشش گھر کے اندر ہی دم توڑ گئی

لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور گھر اور باہر دونوں ہی محاذ پر لڑتی رہیں۔ باہر مزاحمت کم تھی مگر گھر کے اندر خاموش مخالفت زیادہ تھی۔ ریڈیو لکھنؤ میں آنے جانے اور وہاں مسلسل پروگرام کمپیئر کرنے کی وجہ سے سعیدہ کے اندر نشریات کی سوجھ بوجھ کے ساتھ ہی اعتماد بھی پیدا ہوا تھا۔ وہ خود کو پہلے سے زیادہ با اعتبار اور با اختیار محسوس کرنے لگیں۔ انھوں نے بچوں کی تربیت میں بھی خصوصی دلچسپی لی اور ان کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا اور دوسری طرف ریڈیو نشریات میں اپنی منزل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں حسیب احمد اور جگل کشور کی شخصیت کا اثر ان پر پڑا اور ریڈیو نشریات کی پیشکش میں یہ اثرات نظر بھی آنے لگے۔ ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے ہنس راج لتھرا نے انڈین براڈکاسٹنگ میں سعیدہ بانو کو جن لفظوں میں یاد کیا اگر اس کا خلاصہ پیش کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سعیدہ بانو کا تعلق ایک قدامت پسند مسلم گھرانے سے تھا۔ وہ پہلی مسلم خاتون تھیں جو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر 40 کے شروعاتی دور میں بچوں کے پروگرام کمپیئر کرتی تھیں باوجود اس کے کہ انھیں گھر میں اس کام کو لے کر سخت مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر والوں کی مخالفت ان کے کام کرنے کے اس مقام کو لے کر تھی جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ جگہ یعنی ریڈیو غیر اخلاقی پیشہ ور گانے والیوں کے لیے ہے نہ کہ شرفا کے گھرانے سے تعلق رکھنے والی خواتین کے لیے لیکن انھوں نے یہ یقین دلایا کہ وہ اپنا راستہ خود بنانے کے اہل ہیں اور انھوں نے یہ ثابت بھی کیا۔ (صفحہ:105)

فروری 1947 میں سعیدہ بانو نے آل انڈیا ریڈیو میں نیوز ریڈر کے لیے درخواست بھیج دی اور Disc پر اپنی آواز بھی۔ پانچ ماہ تک وہ اپنی گھریلو مصروفیات میں لگی رہیں کبھی لکھنؤ تو کبھی بھوپال۔ وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ملازمت سے متعلق لکھتی ہیں:

''جولائی 1947 میں مجھے دہلی سے خط موصول ہوا کہ آل انڈیا ریڈیو میں میری درخواست منظور کرلی گئی ہے اور مجھے 10 راگست کو دہلی پہنچ کر ہندوستان (ہندوستانی) میں خبریں پڑھنے کی ذمہ داری قبول کرلینی چاہیے۔''

(بحوالہ ڈگر سے ہٹ کر۔ صفحہ 133)

گھر والوں کو جیسے ہی اس کی خبر ملی تو ناگواری کا اظہار کیا گیا۔ سسرال میں ساس غم زدہ تھیں تو میکہ میں بہن۔ ان کے دہلی جانے کی خبر جب بھائی کے پاس بھوپال پہنچی تو وہ بھی دل برداشتہ ہوئے مگر لکھنؤ آکر ملاقات کی۔ چند افراد خانہ نے مشورہ بھی دیا کہ لکھنؤ سے بھوپال چلی جاؤ اپنے بھائی کے پاس لیکن سعیدہ کی انا پسند طبیعت نے اسے گوارا نہیں

کیا۔ وہ لکھتی ہیں:

''میں اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤں ایک ناقابل عمل مشورہ ہے۔ مجھے اپنے بھائی سے محبت بہت تھی۔ لیکن جب اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے تو والہانہ محبتوں میں بھی دراڑ پڑنے لگتی ہے۔'' (ایضاً ص 134)

گویا سعیدہ بانو نے زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے اپنے بھائی کو سہارا نہیں بنایا بلکہ اپنی خوداعتمادی کے سہارے وہ آگے بڑھنے لگیں۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ لکھنؤ کی فضاؤں سے نکل کر دہلی کی فضاؤں میں رہ کر سامعین سے مخاطب ہوں۔ اس طرح تمام رکاوٹوں اور پریشانیوں سے نپٹتے ہوئے 9/اگست 1947 کو دہلی کے لیے روانہ ہوئیں۔ 10/اگست کو دہلی پہنچیں اور سکندرہ روڈ کے Hutment میں اپنے ایک عزیز کے یہاں قیام کیا۔ وہ لکھتی ہیں:

''مجھے آل انڈیا ریڈیو میں خبریں نشر کرنے کی نوکری مل گئی تھی۔ 11/اگست کو مجھے اپنی ذمہ داریوں کا چارج لینا تھا۔ 11/اگست کی صبح آل انڈیا ریڈیو پہنچی ڈائریکٹر نیوز سے ملی۔''

(ایضاً ص 137)

دوسرے دن یعنی 12/اگست 1947 کو وہ پھر ریڈیو گئیں جہاں ان کا ڈیوٹی چارٹ بن گیا تھا اور انھیں 13/اگست کی صبح آٹھ بجے کی ہندوستانی خبریں نشر کرنی تھیں۔

دوسری جانب ہندوستان آزادی کے حصول کی آخری دہلیز پر کھڑا تھا۔ ملک کے اندر زور شور سے تیاریاں کی جارہی تھیں۔ سعیدہ ایک عجیب اور انجانے خوف سے بھی دوچار رہیں۔ لکھنؤ اور بھوپال کا چھوٹنا اور اپنوں کا مشورہ نہ مان کر دہلی آنا بھی ان کے لیے ایک ذہنی بوجھ بنا ہوا تھا لیکن ایک باہمت خاتون کی طرح وہ اس کا مقابلہ کرتی رہیں اور 13/اگست 1947 کی صبح وہ خبریں پڑھنے کے لیے آل انڈیا ریڈیو دہلی پہنچ گئیں۔ اس سے پہلے دن کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ:

'13/اگست کی صبح ساڑھے چھے بجے پہلی بار ریڈیو پر خبریں پڑھنے دفتر پہنچ گئیں۔ بی بی سی اور دہلی ریڈیو میں اس سے پہلے کبھی کوئی عورت خبریں پڑھنے پر مقرر نہیں کی گئی تھی۔ میں پہلی عورت تھی جس کو دہلی نے خبریں پڑھنے کے لائق سمجھا تھا۔ یہ بھی کہ پہلے اپنا نام بتائیں ریڈیو پر اور پھر خبریں شروع کیجیے۔ سننے والوں نے میری آواز اور خبریں پڑھنے کے انداز کو بہت پسند کیا۔ Statement اخبار میں میری تعریف نکلی۔'' (ص 138)

اس وقت ان کی تنخواہ 350 روپے تھی۔ 13/اگست 1947 سے اپریل 1965 تک وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے خبریں پڑھتی رہیں۔ ان کی خبریں پڑھنے کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے صغرا مہدی نے لکھا ہے:

''خواتین کی بڑی تعداد ایسی ہے جنھوں نے ریڈیو پر کل وقتی یا جزوقتی نوکری کرکے اردو زبان وادب کی خدمت کی ہے۔ ایسی خواتین میں سب سے اہم نام سعیدہ بانو کا ہے، جنھوں نے ایک طویل عرصے تک ریڈیو پر خبریں پڑھیں۔ اپنے صحیح تلفظ، لفظوں کی ادائیگی اور بے حد خوبصورت آواز سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا۔'' (بحوالہ ادب میں دہلی کی خواتین کا حصہ، ص 266)

اب تک یہ خاتون براڈکاسٹر اپنی نجی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے نبرد آزما تھی۔ دہلی اور لکھنؤ کے درمیان ایک نئے رشتے کی تعمیر کر رہی تھیں۔ لیکن کسے خبر تھی کہ سعیدہ کے خبریں پڑھنے کے دو دن بعد ہی ملک میں آزادی کا بگل بج جائے گا۔ وہ کون ہے جو آزادی کی فضا میں سانس لینا نہیں چاہتا لیکن وطن عزیز کی آزادی پر جتنا جانی ومالی نقصان ہوا وہ ہماری تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ دہلی میں اس کے اثرات زیادہ تھے۔ راتوں رات صدیوں سے رہنے والے مہاجر بن گئے اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ سعیدہ اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ Hutment 13 سکندرہ روڈ میں مقیم رہیں اور ظلم وبربریت کا ننگا ناچ دیکھتی رہیں۔ وہ کسی طرح جان بچا کر اپنے بچے کے ساتھ رفیع احمد قدوائی کی کوٹھی 6 کنگ ایڈورڈ روڈ پہنچ گئیں۔ اس بھیانک فرقہ وارانہ فسادات کے درمیان سعیدہ نے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور نہ ہی ان کے دماغ میں یہ بات آئی کہ واپس لکھنؤ یا بھوپال چلی جاؤں جہاں ان کے سارے عزیز واقارب اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ دہلی کی اس خوں آلود فضا میں بھی وہ ہمت نہیں ہاریں اور ستمبر (1947) تک وہ ریڈیو جاتی رہیں اور اپنا فرائض منصبی ادا کرتی رہیں۔ ستمبر 1947 میں بلوہ کا زور کم ہوگیا تھا لیکن پھر بھی روزانہ کسی نہ کسی واردات کی خبریں ملتی ہی رہتی تھیں اور سعیدہ بانو کو صرف دن کی خبریں پڑھنے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ ان حالات میں سعیدہ نے پندرہ اگست 1947 کو سارا دن ریڈیو میں گزارا اور بغیر کسی عذر کے لال قلعہ پر قومی پرچم لہرانے کی تقریب کو سنتی رہیں اور یوں ان کی زندگی کے شب وروز ان حالات میں بھی گزرتے رہے لیکن کبھی بھی انھوں نے خود کو واپسی (Rollback) کرنے پر آمادہ نہیں پایا۔ آہستہ آہستہ

حالات درست ہوئے اور لکھنؤ سے بھی سعیدہ احمد کا رشتہ بنا رہا اور اپریل 1965 میں ان کا تبادلہ پروڈیوسر کی حیثیت سے اردو مجلس میں ہوگیا۔

رفعت سروش اپنی کتاب میں سعیدہ بانو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آل انڈیا ریڈیو کی تاریخ میں یہ نام (سعیدہ بانو) کئی حیثیتوں سے اہم ہے۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے بحیثیت اسٹاف آرٹسٹ کی ملازمت شروع کی۔ وہ وہاں اناؤنسر تھیں اور عورتوں کا پروگرام بھی پروڈیوس کرتی تھیں پھر جب تقسیم وطن کا سانحہ ہوا تو وہ سعیدہ بانو کے نام سے دہلی آکر اردو خبریں پڑھنے لگیں۔1966 میں ان کا تبادلہ نیوز یونٹ سے اردو مجلس میں ہوگیا۔''

(بحوالہ آل انڈیا ریڈیو اور اردو، صفحہ 27)

مذکورہ کتاب رفعت صاحب کی یادداشت پر مبنی ہے۔اس وجہ سے کہیں کہیں سہو ہوگیا ہے اور اس میں تحقیق کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ سعیدہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں جز وقتی اور اناؤنسر تھیں۔انھوں نے خود کو کبھی اسٹاف آرٹسٹ نہیں لکھا اور نہ ہی انھوں نے آزادی کے بعد دہلی آکر خبریں پڑھنی شروع کیں بلکہ گزشتہ صفحات میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ انھوں نے 13/اگست 1947 کو پہلی بار آل انڈیا ریڈیو سے ہندوستانی میں خبریں پڑھیں نہ کہ اردو میں۔خود سعیدہ لکھتی ہیں کہ اسی مہینہ (اپریل 1965) میں، میں نیوز ریڈر سے سبکدوش ہوکر پروڈیوسر مقرر ہوئی اور اردو مجلس کے ساتھ منسلک کردی گئی۔ (صفحہ 224-223)

لیکن یہاں ان کا قیام محض ایک مہینہ ہی رہا اور غالباً مئی 1965 میں ان کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو کی نوزائیدہ بیرونی نشریات اردو سروس میں ہوگیا۔ یہاں انھوں نے نہایت جاں فشانی سے اردو کے پروگراموں کو ترتیب دیا۔

اور ہوا بھی یہی کہ ٹھیک 15/مئی 1965 کی صبح سات بجے اردو سروس کی پہلی مجلس کی نشریات کا آغاز ہوا اور سعیدہ بانو کی آواز میں یہ پہلا جملہ برصغیر کی فضاؤں میں گونجا کہ یہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس ہے۔ اس پروگرام کو پاکستان کے سامعین نے سنا اور ہندوستان کے کئی وزرا، ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو، سابق ہائی کمشنر کیول سنگھ نے بھی سعیدہ کے اس اناؤنسمنٹ کو سنا۔ اس پروگرام کو شروع کرنے سے قبل اس کی تشہیر بھی ریڈیو سے کی گئی تھی، دو تین دن تک سعیدہ مسلسل تینوں مجلس کی نشریات میں اناؤنسمنٹ کرتی رہیں اور اپنے حسن تدبر اور تجربے کی بنیاد پر اردو دنیا کو نئے نئے پروگرام سناتی رہیں لیکن بہت جلد ہی انھیں اس ذمہ داری سے سبکدوش کرکے بچوں اور خواتین کے پروگرام کی ذمہ داری دی گئی۔

انھوں نے بڑی حسن وخوبی اور ذمہ داری کے ساتھ نہ صرف اردو کے پروگراموں کی تدوین اور اختراع میں اہم کردار ادا کیا بلکہ اردو سروس کے انتظامی امور میں بھی پیش پیش رہیں۔ ان کے حسن اخلاق اور لکھنوی رکھ رکھاؤ نے تمام لوگوں کو گرویدہ بنالیا تھا اور 58 برس کی عمر میں اردو سروس سے وظیفہ یاب ہوئیں۔ اس دوران انھوں نے خواتین کو بااختیار بنانے اور انھیں ان کی منزل تک رسائی حاصل کرنے کی بھی سعی جمیل کی۔ 'بزم خواتین' پروگرام کے ذریعہ انھوں نے نشریات کے شعبے میں آنے والی خواتین کی ہمت افزائی کی اور نشریات کی باریکیوں کو بتایا۔ اس کے نتیجے میں اردو نشریات سے خواتین کی وابستگی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان کے بعد اردو سروس میں جن خواتین نے نشریات میں اپنی مستقل جگہ بنائی اور سامعین کے درمیان مقبول رہیں ان میں مریم کاظمی، طاہرہ نیازی، عذرا قریشی، کشور زیدی، تسنیم فضل، نجمہ رضوی اور ریڈیو نیوز میں ریحانہ فریدی اور مدبرہ عثمانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان خواتین براڈ کاسٹرس نے اس کارواں کو اور آگے بڑھایا اور خواتین کو بااختیار بنانے اور ان میں عزم و اعتماد پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ان سب کی پیش رو برقع پوش خاتون تھیں جنھوں نے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے اپنے کریئر کا آغاز کیا اور آل انڈیا ریڈیو کی بیرونی نشریات کی مایہ ناز سروس 'اردو سروس' پر وظیفہ یاب ہوئیں۔ آج بھی 'اردو سروس' کے سینئر رفقا میں سعیدہ آپا کی باتیں ہوتی ہیں اور انھیں یاد کیا جاتا ہے ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

Refrences

1. This is All India Radio :U L Barua
2. Indian Broadcasting : H R Luthra
3. ڈگر سے ہٹ کر: سعیدہ بانو احمد
4. اردو ریڈیو اور ٹیلی وژن میں ترسیل وابلاغ کی زبان: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی
5. دکن اداس ہے یارو: مرزا ظفر الحسن
6. آل انڈیا ریڈیو اور اردو: رفعت سروش
7. نواح ادب: قمر جمالی (حیدرآباد)
8. آل انڈیا ریڈیو کا ترجمان رسالہ آواز

(بحوالہ: ہندوستان میں تانیثیت، مرتب عذرا عابدی، قومی اردو کونسل، نئی دہلی)

□□□

شاعرات کے منتخب اشعار

کنارہ ڈوبنے کا دیکھنے کے بعد منتظر ہم
مٹا کر شاد ہولیتے ہیں نقشے سے سمندر ہم

بچھڑ کے بھیڑ میں خود سے حواسوں کا یہ عالم تھا
کہ منھ کھولے ہوئے تکتی رہیں پرچھائیاں ہم کو

وفا لکھنوی

قدم اٹھا کہیں ہم نے بھی اس یقین کے ساتھ
جہاں سے گزریں گے ہم تیری رہ گزر ہوگی

گزرے ہوئے لمحوں کو اب ساتھ ہی رہنے دو
کچھ دن کی نہیں ان سے برسوں کی رفاقت ہے

مظفر النساء ناز

تھا مرا ہوش بھی وہ میرا جنوں بھی وہ تھا
راحت چشم بھی وہ قطرۂ خوں بھی وہ تھا

دل کی دھڑکن ہے تری یاد میں کتنی دلکش
شب کے سناٹے میں کوئل کی صدا ہو جیسے

شان معراج

چلچلاتی دھوپ میں سر کو چھپانے کے لیے
ریگ زارِ زندگی میں دور تک سایہ نہیں

دریا کا تذکرہ نہیں ساحل کی بات ہے
ٹھہرے ہوئے سفینوں میں طوفان بہت ملے

سیما نظمی

ہم اپنے گھر میں بھی اب ہیں مسافروں کی طرح
ہر ایک چیز یہاں اجنبی سی لگتی ہے

بند کرلیں کس طرح ہم گھر کا دروازہ حیات
دل مسافر ہے کبھی تو لوٹ کر گھر آئے گا

مسعودہ حیات

چھپا کے رکھ دیا پھر آ گہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے تھے

ستم شناس ہوں لیکن زباں بریدہ ہوں
میں اپنی پیاس کی تصویر بن کے زندہ ہوں

کشور ناہید

یہ لمحہ بھی، اس لمحے کی مہلت بھی اس کی
جو دید سے محروم وہ ساعت بھی اسی کی

وہ ساتھ تھا شبنم تو ہواؤں پہ قدم تھے
اب ڈوب گئے ہم تو ندامت بھی اسی کی

صدیقہ شبنم

تمام عمر کا حاصل جسے میں سمجھتی تھی
گزر گیا وہی لمحہ اداس کرکے مجھے

وہ اک لطیف سا جھونکا متاعِ جاں ثروت
چلا گیا ہے کہ خوش لباس کرکے مجھے

نور جہاں ثروت

اردو میں غدر 1857 سے متعلق تاریخیں

ڈاکٹر شہناز بیگم

1857 کی جنگ آزادی ہندوستانی تاریخ کا نہایت اہم باب ہے۔اس موضوع پر اردو میں خاصی تعداد میں تاریخیں لکھی گئیں۔ انگریز مورخین کے علاوہ ہندوستانیوں نے بھی تاریخ کے اس اہم ترین واقعہ کو روزنامچوں،خودنوشت حالات،خطوط اور شہر آشوب (1) کی شکل میں محفوظ کیا ہے۔اگرچہ ان میں حکومت کے عتاب کے خوف سے مکمل حق گوئی سے کام نہیں لیا گیا ہے لیکن پھر بھی اکثر مقامات پر سچائی ابھر آتی ہے۔دراصل ان تاریخوں کے لکھنے کا مقصد انگریزوں کی نظر میں خود کو بے گناہ ثابت کرنا تھا۔

غدر 1857 کے سلسلے میں لکھی ہوئی کتابوں میں روز نامچوں کی بہت اہمیت ہے۔غالب کی ''دستنبو'' کے علاوہ تین اور روزنامچوں کا حوالہ ملتا ہے۔معین الدین حسن خاں کی ''خدنگِ غدر'' عبداللطیف کا روز نامچہ، جیون لال (2) کا روزنامچہ۔اس طرح اردو میں تحریک 1857 پر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد بڑی تعداد میں موجود ہے جو کہ 1857 کے صحیح تاریخی حالات لکھنے کے لیے بہترین ماخذ ہیں۔جن میں بہادر شاہ ظفر، مغل شہزادوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور 1857 سے قبل کے لال قلعہ اور دلّی کی تہذیبی زندگی کے مرقع پیش کیے ہیں۔ذیل میں ۱۸۵۷ء پر لکھی گئیں چند تاریخیں درج ہیں۔

تاریخ سرکشی ضلع بجنور (3) از سر سیّد احمد خاں

غدر 1857 سے متعلق تاریخوں میں تاریخ سرکشی ضلع بجنور اہم ترین تصنیف ہے جو 1858 میں آگرہ سے شائع ہوئی۔یہ کتاب 1857 کی ضلع بجنور میں جدوجہد آزادی کی چشم دید تاریخ ہے۔اس میں مئی 1857 سے اپریل 1858 تک کے واقعات غدر مندرج ہیں۔یعنی ان واقعات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو اس ہنگامے کے دوران ضلع بجنور میں رونما ہوئے۔اس کتاب کو جدوجہد آزادی کی ایک ایسی دستاویز کہا جاسکتا ہے جس کا مصنف خود ان واقعات کا عینی شاہد تھا۔

اسباب بغاوت ہند (4) از سر سیّد احمد خاں

یہ کتاب 1859 میں دہلی سے شائع ہوئی جو 89 صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں سر سیّد نے سرکشی کے مختلف اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے غدر کو حکومت کی خامیوں اور خرابیوں کا نتیجہ ثابت کیا ہے اور تمام تدبیریں اور سختیاں گنوائیں ہیں۔مؤلف نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ اہل ہند نے سرکشی کے لیے پہلے سے کوئی سازش نہیں کی تھی۔مسلمانوں میں بھی جہاد کی سازش نہیں تھی اودھ کی ضبطی بھی اس عام فساد کا باعث نہ تھا

فوج میں باہم بغاوت کی صلاح بھی نہ تھی باغی فوج کی پہلے سے بادشاہ دہلی سے بھی سازش نہ تھی بلکہ بہت سی باتیں پہلے سے جمع ہوری تھیں جس سے ہندوستانی انگریزی حکومت کے خلاف ہوگئے تھے اور بقول مؤلف اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انتظام حکومت، قانون سازی اور مشورہ وتدبیر میں ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہ تھا اور حاکم اور رعایا کے درمیان تبادلہ خیالات کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ حکومت کے قوانین کی مصلحت کو اہل ہند نہ سمجھ سکتے تھے بلکہ برعکس سمجھتے تھے اور ان کو سمجھانے کا کوئی ذریعہ اختیار نہ کیا گیا تھا۔ حکومت نے جو قانون نافذ کیے اور انتظامات کیے ان سے ہندوستانیوں میں غلط فہمی پیدا ہوئی اور انھوں نے اس کے دو نتیجہ نکالے ایک یہ کہ سرکار ہندوستانیوں کو مفلس اور تباہ کرنا چاہتی ہے دوسرے یہ کہ ان کے مذہب میں مداخلت اور عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ یہ مسئلہ مدتوں سے چل رہا تھا۔ اس کے بھڑکنے کے لیے کارتوس کاٹنے کا حکم اور نافرمانی پر میرٹھ فوج کو پابہ زنجیر کر کے رسوا کرنا بہانہ بن گیا۔ بہرحال غدر کی معلومات سے متعلق سرسید کا یہ رسالہ قابل مطالعہ ہے۔ اس طرح مؤلف نے اس تاریخ کی ترتیب میں ان تمام عوامل کو پیش کیا ہے جو گذشتہ ایک صدی سے ہندوستانی عوام کو انگریزی حکومت میں پیش آرہے تھے۔

تواریخ بغاوت ہند (5) از کشور لعل

غدر 1857 سے متعلق تاریخوں میں کشور لعل کی ''تواریخ بغاوت ہند'' اہم ترین اضافہ ہے۔ اس کا سن تالیف 1866 ہے۔ مخطوطے کی

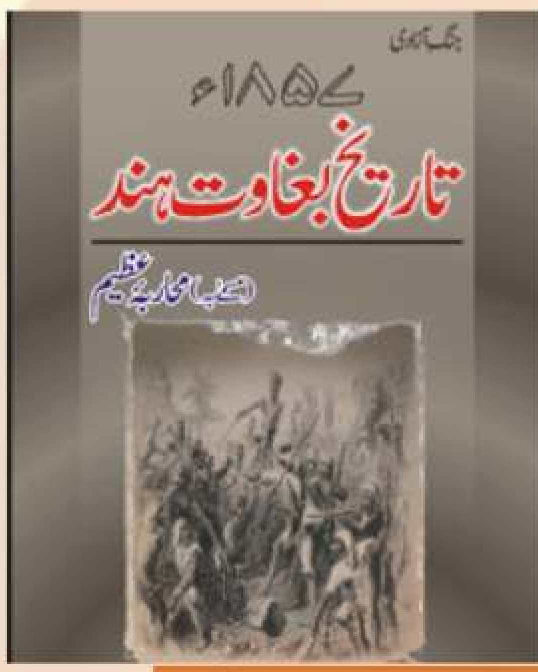

ابتداء میں دیباچہ کتاب ''تواریخ بغاوت ہند'' ہے۔ اس کے بعد فہرست مضامین ہے۔ اس مخطوطے میں 1857 میں انگریزوں نے جن شہروں کی سرکشی کی تھی ان کا ذکر بڑی شرح وبسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۲ حصّوں پر مشتمل ہے۔ ان حصّوں میں جو عنوانات قائم کیے ہیں ان میں محاصرہ دہلی، سرکشی روہیلکھنڈ، بقیہ سرکشی روہیلکھنڈ بجنور، سرکشی جونپور، سرکشی سیتاپور، سرکشی کان پور، سرکشی سلطان پور وغیرہ شہروں پر انگریزوں نے جو ظلم وستم ڈھائے تھے ان کا بیان مستند ماخذ کی روشنی میں قلمبند کیا ہے۔

تواریخ عجیب المعروف بہ کالا پانی (6) از مولانا جعفر تھانیسری (7)

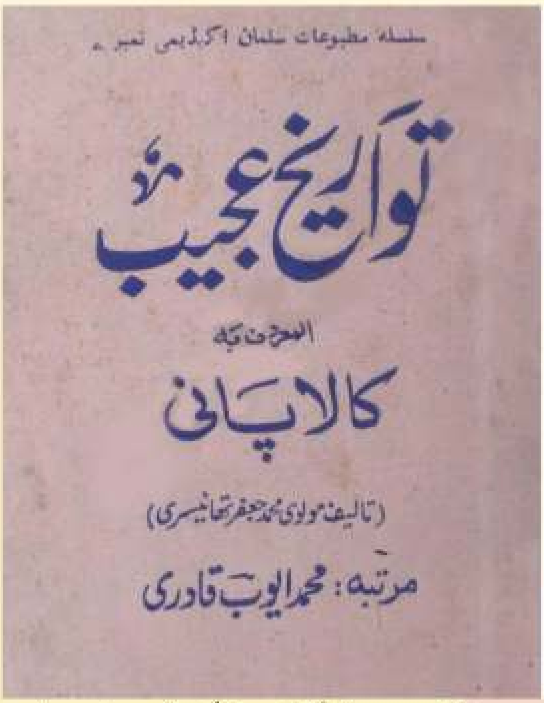

یہ کتاب 1880 میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس کا سن تالیف 1879 مطابق ہے جس کا ذکر مؤلف نے دیباچہ میں کیا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں مؤلف کا کہنا ہے کہ:

''میری پہلی کتاب تاریخ عجیب کا نام بھی تاریخی ہے۔ اور اتفاق حسنہ سے فقط ایک حرف کے تغیر سے اس چھ برس کی کمی بیشی کو پورا کر کے اس کا بھی تاریخی نام "تواریخ عجیب" رکھا گیا۔ گو یہ وہی جلد ثانی ہے۔ جس کے مشتہر کرنے کا ہند میں پہونچنے کے بعد وعدہ تھا۔ میں نے اس کتاب کو بطور روز نامچہ روزمرہ بول چال میں لکھا ہے۔ اور دوسرے لوگوں کے

معتولوں اور قصص کو جہاں تک مجھے یاد تھے بعینہ ہو بہو نقل کیا ہے۔"(8)

اس طرح مؤلف نے اس کتاب میں کالے پانی (انڈمان) میں اپنے قیام کے چشم دید واقعات نہایت دلچسپ انداز میں لکھے ہیں۔ یعنی انھوں نے کالے پانی کے رہنے والوں کی سماجی اور معاشرتی زندگی، ان کے رہن سہن طور طریق اور ہندوستانی قیدیوں پر برطانوی حکومت کے ناقابل تصور ظلم وستم کی مکمل تفصیلات تحریر کی ہیں۔ اس کتاب سے 1857 کی جنگ آزادی کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب 288 صفحات اور چھ فصلوں پر مشتمل ہے۔

بغاوتِ مالوہ، از نظام الدین

یہ کتاب 1857 پر لکھی جانے والی تاریخوں میں اہم ترین ماخذ ہے۔ جس سے بغاوت کے اہم واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں جہاد حریت 1857 میں مالوہ کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب 1894 میں الہ آباد سے شائع ہوئی جو 204 صفحات پر مشتمل ہے۔

خدنگ غدر[9] از معین الدین حسن خاں[10]

غدر سے متعلق تاریخوں میں "خدنگ غدر" بہ حیثیت مجموعی کتاب قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب کا سن تالیف 1887 ہے۔ یہ تصنیف ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو بذات خود اس قلزم خوں کا شناور تھا۔ مؤلف نے کتاب کی ابتدا میں جو تعریف کے کلمات انگریزوں کے لیے لکھے ہیں وہ

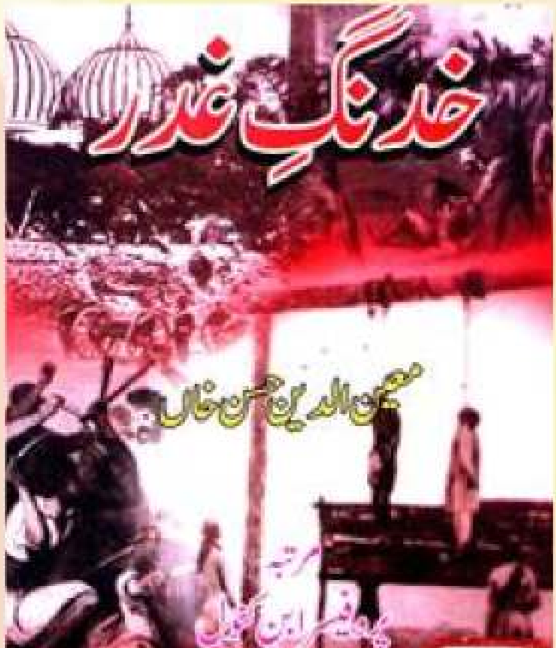

اس زمانے کے دستور کے مطابق ہیں۔ انھوں نے حقائق کو نہایت ڈرتے ڈرتے اشارتاً لکھا ہے۔ مؤلف نے غدر کے واقعات کو اودھ کی ضبطی سے شروع کیا ہے۔ اس کے بعد ہنومان گڑھی کے فساد اور مولوی امیر علی امیٹھوی کی شہادت کا واقعہ درج ہے۔ اس کتاب میں مقدمہ کارتوس کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بغاوت کے تمام اہم مرکزوں کی روداد تفصیل سے بیان کی ہے۔ مؤلف نے جابجا اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بغاوت میں صرف اہل لشکر شامل نہیں تھے بلکہ ان کی مدد عام لوگوں نے بھی کی تھی۔ اس کتاب میں جن طبقوں کا ذکر کیا ہے ان میں سکھ، پنجابی، لوہار، مہاجن، میواتی، دھنئے، جولاہے، کنجڑے، راجپوت، پنساری، حلوائی، صراف وغیرہ طبقوں کا ذکر کیا ہے۔

علاوہ ازیں اسی طرح مؤلف نے اپنے اس تذکرے میں جابجا عورتوں کی غیرت ومحبت اور جانبازی اور بہادری کا ذکر کیا ہے۔ میواتی اور گوجروں کی بغاوت کے سلسلے میں انھوں نے تحریر کیا ہے۔

اس کتاب میں ان انگریزی الفاظ کی بھی کثرت ملتی ہے جو زبان زد خلائق ہوگئے تھے۔ ان میں سے بعض اردو میں بہ جنسہ لے لیے گئے ہیں اور بعض مورد کر لیے گئے ہیں۔ مثلاً سارٹی فلٹ، جرنیلی، گورمنٹ، رجمنٹ وغیرہ کتاب کے آخری حصے میں عبارت بے سروپا اور کچھ مبہم سی ہوگئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے کچھ حصے کاٹ دیئے گئے ہوں۔

سیّد اسمٰعیل حسین منیر، منشی احمد حسن عروج اور نواب مرزا خاں داغ کے قطعات تاریخ اس کتاب کے آخر میں درج ہیں۔

خاتمہ کتاب میں مؤلف رقمطراز ہیں۔

"الحمدللہ یہ کتاب مسمّی خدنگ غدر حسب الحکم آقائے قدیم سرتھافلس چارلس منکاف صاحب بہادر کمشنر پولیس کلکتہ بتاریخ پندرہویں ماہ مئی 1887 مطابق ماہ ربیع الثانی 1295ھ کو تمام ہوئی۔ راقم نے حتی المقدور بے اور رعایت راست، راست تحقیق کر کے صحیح صحیح حالات مفصل ومجمل جو معلوم ہوئے ہیں درج کیے ہیں۔ اکثر اس میں کے چشم دیدہ رقم ہیں۔ لکھنؤ، دہلی وغیرہ کی لڑائی بذات خود میں نے لکھی ہے۔ اس تحقیقات کے بعد بھی علاقہ جات لکھنؤ کا حال فساد سب نہیں لکھ سکا۔ اور جہاں جہاں فساد خفیف ہوئے کوئی لڑائی یا مقابلہ نہیں اس کو قلم انداز کیا کہیں کچھ لکھ گیا ہوں۔"

بہت خیال وحفظ کیا گیا ہے کہ عبارت کتاب میں کوئی لفظ مشکل نہ آوے۔ نہ رنگینی عبارت کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ بلکہ سیدھی سیدھی زبان

کہ جس کو صاحبان انگریز و خاص و عام خوب سمجھ لیں اور محاورات کہ سب کی سمجھ میں آویں لکھے گئے ہیں۔

میرے مکرم عنایت فرما یگانہ زماں سیّد اسمٰعیل متخلص منیر و منشی احمد حسن متخلص عروج و عزیز یگانہ نواب مرزا خاں متخلص داغ نے بھی اس کتاب کو ملاحظہ فرما کر پسند فرمایا اور جو حال ان کے چشم دید تھے راست راست پایا۔ دوستانہ و محبانہ کرم فرمانے تاریخیں اس کتاب کی لکھی ہیں۔

تحریر تمام شد بتاریخ یکم نومبر 1887 بقلم مصنف بہ مقام رام پور بوقت شب اور شبنہ۔

تاریخ غدر (11) از خواجہ حسن نظامی

1857 کے غدر کے سلسلے میں خواجہ حسن نظامی نے بھی کافی تعداد میں تاریخیں شائع کیں۔ ان میں ''تاریخ غدر'' اہم ترین کتاب ہے۔ جس سے غدر 1857 کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب 12 حصوں پر مشتمل ہے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پہلا حصہ بیگمات کے آنسو، دوسرا حصہ انگریزوں کی پتا، تیسرا حصہ محاصرۂ دہلی کے خطوط، چوتھا حصہ بہادر شاہ کا مقدمہ، پانچواں حصہ گرفتار شدہ خطوط، چھٹا حصہ غدر دہلی کے اخبار، ساتواں حصہ غالب کا روز نامچہ غدر، آٹھواں حصہ: دہلی کی جاں کنی، نواں حصہ: دہلی کی آخری سانس، دسواں حصہ: غدر کی صبح و شام، گیارھواں حصہ: دہلی کی آخری شمع، بارھواں حصہ: غدر کا نتیجہ،

بیگمات کے آنسو

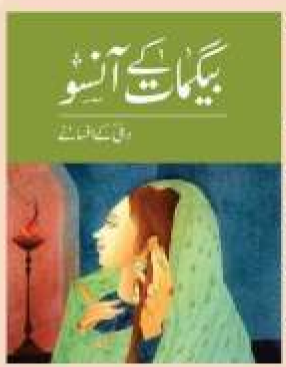

اس کتاب میں وہ دردناک حالات درج ہیں۔ جو غدر 1857 میں بہادر شاہ ظفر اور ان کی بیگمات اور بچوں کو پیش آئے۔ مؤلف نے ''دہلوی تاجدار کے ایک کنبہ کا فسانہ'' عنوان کے تحت ان بے کس عورتوں کی زبانی حالات مندرجہ ذیل عبارت میں درج کیے ہیں۔

''تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے۔ جو تاجداروں کے ٹھوکریں مارتے تھے۔ قسمت نے ان کو بے بس کردیا۔ جو بے کسوں کے کام آتے تھے ہم چنگیز کی نسل ہیں۔ جس کی تلوار سے زمین کانپتی تھی۔ ہم تیمور کی اولاد ہیں۔ جو ملکوں کا اور شہریاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہجہاں کے گھر والے ہیں۔ جس نے ایک قبر پر جواہر بہار دکھادی اور دنیا میں بے نظیر مسجد دہلی کے اندر بنادی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبے میں ہیں۔ ہم عزت والے تھے۔ زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانہ نہیں ملتا۔ وہ کیوں سرکشی کرتی ہے۔ آج ہم پر مصیبت ہے۔ ہم پر آسمان روتا ہے۔'' (12)

انگریزوں کی پتا

یہ حصہ مارچ 1927 میں دہلی سے شائع ہوا جو 64 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انگریزوں کے ان مصائب کا حال درج ہے جو غدر 1857 میں ان کو باغیوں کے ہاتھوں برداشت کرنے پڑے۔

محاصرۂ دہلی کے خطوط

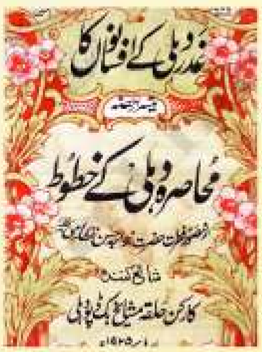

محاصرۂ دہلی کے خطوط 1925 میں دہلی سے شائع ہوئی جو 32 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ان خطوط کا ترجمہ ہے جو انگریزی فوج کے افسروں نے دہلی کے محاصرہ کے وقت پنجاب کے انگریزی افسروں کو بھیجے تھے۔ ان خطوط میں بعض نہایت دلچسپ مخفی اور تاریخی مراسلات بھی شامل ہیں۔

بہادر شاہ کا مقدمہ

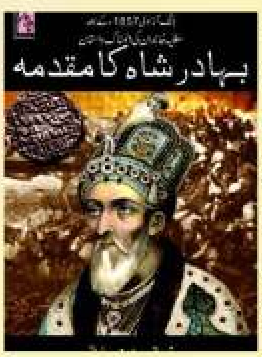

یہ ''تاریخ غدر'' کا چوتھا حصہ ہے۔ اس میں اس مشہور مقدمہ کا حال درج ہے جو مغلوں کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر پر بالزام بغاوت چلایا گیا تھا۔ اور جس کی پیشیاں مدت تک ہوتی ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کی گواہیاں ہوئیں۔ خود بہادر شاہ ظفر کا بیان ہوا۔ دوران مقدمے میں ایسے عجیب و غریب خفیہ راز منکشف ہوئے جن کا کسی کو علم نہیں تھا۔ غرض کہ یہ حصہ شروع سے آخر تک واقعات کا تاریخی سرمایہ ہے۔

گرفتار شدہ خطوط (13)

یہ حصہ ان خفیہ خط و کتابت پر مشتمل ہے جو بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی اور غدر کرنے والوں کے درمیان ہوئے تھے۔ جن کو غدر کے بعد انگریزوں نے لال قلعہ سے گرفتار کیا تھا۔

غدر دہلی کے اخبار

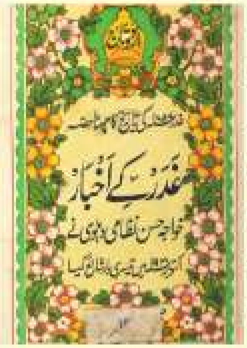

یہ "تاریخ غدر" کا چھٹا حصہ ہے۔اس میں 1857 کے ان اخبارات کے مضامین ہیں جو دہلی میں چھپ کر شائع ہوئے تھے۔ اور جن پر غدر کی آگ بھڑکنے کا الزام لگایا تھا۔اس میں اخبارات کے کچھ اقتباس بھی نقل کیے گئے ہیں۔ان اقتباسات میں صادق الاخبار کے وہ مضامین درج ہیں۔جو عین غدر کے دن اور غدر کے چار مہینے بعد تک شائع ہوتے رہے۔یہ حصہ 1923 میں دہلی سے شائع ہوا جو۲۴صفحات پر مشتمل ہے۔

غالب کا روزنامچۂ غدر

غالب کا روزنامچہ غدر کے چشم دید حالات پر مشتمل ہے۔جو غالب نے زمانہ غدر کے حالات کی نسبت لکھا تھا۔اس میں دہلی کی عمارتوں، دہلی کی شخصیتوں، دہلی کی قدیمی معاشرت، دہلی کے پرانے احساسات کا اتنا بڑا تاریخی ذخیرہ موجود ہے۔

غالب کے روزنامچہ کی اہمیت اس پہلو میں پوشیدہ ہے کہ غدر کی تاریخ لکھنے والے عموماً یا تو انگریز تھے یا انگریزوں کے زیر اثر مؤرخ اس وجہ سے ان میں واقعات کا ایک رخ دکھایا گیا ہے۔مگر غالب کے اس روزنامچہ سے واقعات کے اصلی حقائق پر روشنی پڑتی ہے۔اس طرح اس حصے میں غالب کی تحریریں احوال غدر کے متعلق جمع کی گئی ہیں۔اور غالب کی مشہور کتاب دستنبو(14) کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔

دہلی کی جاں کنی

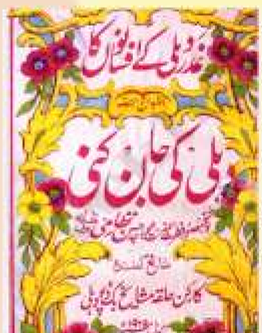

یہ تاریخ غدر کا آٹھواں حصہ ہے جو 1923 میں شائع ہوا۔اس میں غدر 1857 کے ان تاریخی حالات کا تذکرہ درج ہے جو دہلی میں شاہی خاندان، امراء اور تمام ہندو مسلمان باشندگان دہلی کو پیش آئے تھے۔مثلاً لوٹ مار، قتل عام، پھانسیاں، بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کا قصہ، ان کے لڑکوں کا قتل کیا جانا اور ہڈسن کا خون پینا، اس کے علاوہ اس میں بہادر شاہ ظفر، شہزادہ جواں بخت، مرزا فخرو ولی عہد، مرزا مغل، کمانڈر ان چیف، حکیم اسداللہ خاں، نواب حامد علی خاں، مرزا الٰہی بخش، نواب محبوب علی خاں اور بادشاہ کے دربار عام کی تصاویر بھی ہیں، اور بہادر شاہ ظفر کی وہ دردناک تصویر بھی ہے جو بحالت قید رنگون میں اس وقت لی گئی تھی جب کہ وہ جاں کنی میں مبتلا تھے اور جس کے چند منٹ بعد وہ مر گئے تھے۔

دہلی کا آخری سانس (15)

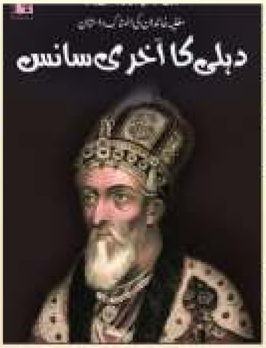

"تاریخ غدر" کا یہ نواں حصہ 1925 میں دہلی سے شائع ہوا۔جو 402 صفحات پر مشتمل ہے۔یہ احسن الاخبار بمبئی کا فارسی اطلاعات کا ترجمہ ہے۔بقول حسن نظامی:

"اس میں یہ ثابت ہوگا کہ غدر 1857 سے چند سال پہلے دہلی اور تیموری سلطنت کا آخری سانس کس قدر حسرت ناک تھا۔اور اس منظر سے ہندوستانیوں کے دل پر کیسا اثر ہوتا ہے" (16)

غدر کی صبح و شام

یہ "تاریخ غدر" کا دسواں حصہ جو 1926 میں شائع ہوا۔یہ حصہ معین الدین حسن خاں اور جیون لال کے دو خفیہ روزنامچوں پر مشتمل ہے۔اس کے 272 صفحات ہیں۔

دہلی کی آخری شمع

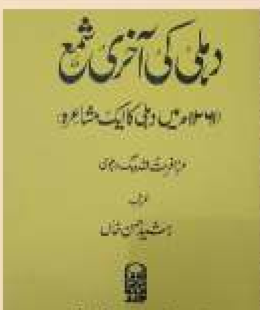

یہ کتاب مرزا فرحت اللہ بیگ کی طبع زاد تصنیف ہے جسے خواجہ حسن نظامی نے اپنے سلسلۂ تاریخ غدر کے گیارہویں حصے کے طور پر پیش کیا ہے۔مصنف نے اس میں 1857 کے انقلاب دہلی کے بعد غدر سے پہلے کی آخری جھلک کی اس طرح عکاسی کی ہے کہ جیتی جاگتی محفل آراستہ ہوگئی۔انھوں نے آزاد کی نیرنگ خیال اور مولوی کریم الدین کے تذکرے "طبقات الشعرائے ہند" کی روشنی میں اس فرضی مشاعرے کی بنیاد رکھی۔اس کتاب کی تصنیف سے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ نے دہلی کی آخری شمع کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے جو درج ذیل ہے۔

"مجھے بچپن سے شعرائے اُردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق

رہا۔مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ملی جو ان کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی۔۔۔اتفاق دیکھئے۔پرانے قدیم کاغذات میں مجھے حکیم مومن خاں دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی۔قلمی تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا تو کبھی محمد حسین آزاد مرحوم کے نیرنگِ خیال کی محفل شعراء کی طرح ایک مشاعرہ قائم کروں، مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کے بجائے صرف ان کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھیں۔خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی اور اس پختگی خیال نے ایک مشاعرے کا خاکہ پیش کر دیا۔"

غدر کا نتیجہ

یہ "تاریخ غدر" کا بارہواں حصہ ہے۔اس میں تمہید وتشریح خواجہ حسن نظامی نے لکھی ہے۔یہ کتاب 1930 میں دہلی سے شائع ہوئی۔جو 72 صفحات پر مشتمل ہے۔

افسانۂ غم[17] از مولانا سیّد امیر احمد

یہ کتاب 1938 میں دہلی سے شائع ہوئی۔جو 48 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں غدر سے متعلق جن پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ان میں غدر 1857 کے اسباب، دردناک مصیبتیں، میرٹھ میں غدر کی ابتدا ،شہزادوں اور بیگمات کا قتل ،بہادر شاہ ظفر کی ہولناک پریشانیاں اور اس کی ہمایوں کے مقبرے میں پناہ وگرفتاری، مقدمہ ،دہلی سے آخری رخصت، رنگون میں نظر بندی بادشاہ کے آخری ایام اور ان کا کس مپرسی کے عالم میں ہونا وغیرہ دردناک واقعات درج ہیں۔اس میں مؤلف کا اندازِ بیان عام فہم ہے۔البتہ کسی کسی فقرے میں غالب کا رنگ موجود ہے۔

غدر کے چند علما[18] از مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی

یہ کتاب 1944 میں دہلی سے شائع ہوئی جو 144 صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں جنگِ 1857 میں حصہ لینے والے چند علماء کے سوانح حیات درج ہیں۔ان علماء میں مولانا امام بخش صہبائی دہلوی، دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ دہلوی، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ دہلوی، منشی محمد اسمعیل حسین منیر شکوہ آبادی، مولانا محمد جعفر تھانیسری، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، شہزادہ فیروز شاہ (باغی شہزادہ ، بریلی کا نواب اور مولانا پیر علی، سردار احمد خاں اہم ہیں) علماء وغیرہ کے سوانح حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مؤلف نے اس کتاب کی تصنیف وتالیف میں قیصر التواریخ ،تاریخ بغاوتِ ہند ، یادگارِ غالب، تذکرۂ مصنفین ،تاریخ شاہ جہاں پور وغیرہ ماخذات سے استفادہ کیا ہے۔

سن 1857 کا خونی غدر[19] از ٹھاکر سنگھ سود

یہ کتاب امرتسر سے شائع ہوئی جو 320 صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں جنگ پلاسی سے لے کر 1861 کے واقعات درج ہیں۔مؤلف نے اس کتاب میں جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ان میں ہندوستان میں انگریزی راج کی قائمی، لارڈ ڈلہوزی اور میرٹھ میں غدر کا آغاز، بغاوت کے اسباب، ہندوستان پر انگریزوں کے ظلم وستم، غدر کے نتائج، رانی لکشمی بائی، نانا صاحب اور دیگر رہنماؤں کا کردار وغیرہ کے علاوہ جن علماء نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی ان میں فیض احمد اللہ شاہ نامی ایک مولوی کا ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ دیسی راجگان نے انگریزوں کی مدد کی۔چنانچہ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ کتاب غدر 1857 کے مواد میں بیش قیمتی اضافہ ہے۔

مذکورہ بالا ان کتابوں کے علاوہ اور بھی تاریخیں لکھی گئیں۔جن میں بہادر شاہ ظفر، مغل شہزادوں اور اس عہد کے سماجی ومعاشرتی حالات درج ہیں۔علاوہ ازیں 1857 سے قبل کے لال قلعہ اور دلی کی تہذیبی زندگی کے مرقع پیش کئے گئے ہیں۔ان کتابوں میں منشی فیض الدین کی "بزم آخر"[20]،سید وزیر حسن دہلوی کی تالیف دہلی کا دیدار عرش تیموری کی "قلعہ معلّی کی جھلکیاں[21] "، راشد الخیری کی "نوبت پنج روزہ یعنی وداغ ظفر"، سیّد ناصر نذیر فراق کی کتاب "لال قلعہ کی ایک جھلک"

منکد لال[22] کی "تاریخ بغاوت ہند" اور سید ظہیر الدین دہلوی کی داستان غدر جو 1857 کے سلسلے میں اہم ترین ماخذ ہے۔یہ کتاب ہنگامہ 1857 کے چشم دید حالات پر مشتمل ہے۔

اس گھر کو آگ لگ گئی (غداروں کے خطوط)

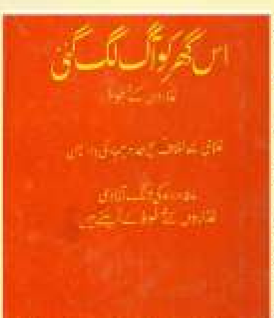

1993 میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے اس گھر کو آگ لگ گئی کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔یہ کتاب ان خطوط کا مجموعہ ہے جو 1857 کی جنگ آزادی میں ہندوستانی غداروں اور جاسوسوں نے برطانوی افسران کو لکھے تھے۔یہ سارے خطوط اور دستاویزات لندن کے انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہیں۔اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے حرفِ آغاز میں لکھا ہے۔

''اس گھر کو آگ لگ گئی پہلی با قاعدہ جنگ آزادی 1857 کے نام انقلاب پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اس میں انگریزی فوج کے افسروں کے نام ان ضمیر فروشوں اور ملک کے دشمن ہندوستانی جاسوسوں اور غداروں کے خطوط ہیں جنھوں نے تھوڑی سی دولت کی تمنا اور ہوس جاہ و منصب کا شکار ہو کر وطن کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ جن زنجیر کو توڑنے کے لیے تقریباً سو سالوں تک آزادی کے ہزاروں مت والوں نے سینے پر گولیاں کھا کر پھانسی کے تختے پر لٹک کر جان عزیز کی قربانی پیش کی۔ (23)

اس طرح غدر 1857 سے متعلق ان تاریخوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان مورخین نے 1857 کے واقعات سے متعلق مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ان واقعات کی ایک خاص زاویہ نظر سے تشریح کی ہے جو تاریخ نگاری کے نقطۂ نظر سے اہمیت کی حامل ہے۔

حواشی

1۔ غالب کے شاگرد تفضل حسین کوکب نے 1857 سے متعلق تمام شہر آشوب ''فغانِ دہلی'' کے نام سے 1862 میں شائع کرائے۔

2۔ جیون لال انگریزوں کا جاسوس تھا پھر بھی اس کے روزنامچے میں بہت اہم واقعات موجود ہیں خواجہ حسن نظامی نے غدر کی صبح و شام میں اس روزنامچے کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

3۔ یہ نسخہ انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی، صولت پبلک لائبریری رامپور اور رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔

4۔ مملوکہ اُردو گھر لائبریری انجمن ترقی اُردو ہند

5۔ یہ مخطوطہ صولت پبلک لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس کا نمبر شمار 637 ہے۔

6۔ مملوکہ سینٹرل لائبریری جامعہ ہمدرد، انجمن ترقی اُردو ہند دہلی

7۔ جعفر تھانیسری برطانوی فوج میں ملازم تھے ان پر الزام تھا کہ وہ افغانستان کی لڑائی میں انگریز فوج کے خلاف افغانیوں کو آدمی اور روپیہ فراہم کر رہے ہیں 1863 میں ان کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔

8۔ تواریخ عجیب المعروف بہ کالا پانی، جعفر تھانیسری، ص۔ 2

9۔ یہ کتاب 1972 میں دہلی سے شائع ہوئی اس کا انگریزی ترجمہ 1898 میں انگلستان میں شائع ہوا۔ دراصل مؤلف نے چارلس تھوفلس جان منکاف کے اصرار پر یہ کتاب لکھی۔

10۔ معین الدین حسن خاں، نواب اشرف الدولہ قدرت اللہ بیگ خاں بہادر غالب جنگ کے بیٹے تھے۔ ان کے اجداد یارقند، سمرقند اور بخارا شریف سے احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ہندوستان میں آئے۔ 1803 میں جب انگریزوں کی عملداری قائم ہوئی تو مؤلف کے بزرگان خاندان سرکار انگلشیہ میں بہ حسن خدمت کارگزاری، اچھی جاگیر کثیر پینشن اور اچھے مرتبے پر رہے۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب بغاوت ہوئی تو معین الدین پہاڑ گنج دہلی کے تھانے پر بادشاہ کی طرف سے کوتوال تھا اس پُر آشوب دور میں اس نے منکاف کی جان بچائی۔ لیکن انگریزوں کی فتحیابی کے بعد خود اس کا گھر بار مال و اسباب سب کچھ لوٹ چکا تھا۔ دہلی سے بمبئی اور بمبئی سے حجاز مقدس چلا گیا۔ تحقیقات ہوئی اس پر مقدمہ چلا لیکن منکاف کی کوششوں سے بری ہو گیا۔

11۔ مملوکہ اُردو گھر لائبریری، ہارڈنگ لائبریری، صولت پبلک لائبریری رامپور

12۔ بیگمات کے آنسو، خواجہ حسن نظامی، ص۔ 27

13۔ 1933 میں دوسری بار شائع ہوا اور یہی حصہ 1944 میں غدر کے فرمان کے عنوان سے شائع ہوا۔

14۔ یہ کتاب اُن حالات و واقعات کے بیان پر مشتمل ہے جو دہلی میں 11/ مئی 1857 سے لے کر 31/ جولائی 1858 تک رونما ہوئے۔

15۔ یہ حصہ 1935 میں (پانچویں بار) بہادر شاہ کا روزنامچہ کے نام سے شائع ہوا۔

16۔ دہلی کا آخری سانس، خواجہ حسن نظامی، ص۔ 2

17۔ مملوکہ صولت پبلک لائبریری رامپور

18۔ مملوکہ سینٹرل لائبریری دہلی یونیورسٹی

19۔ مملوکہ سینٹرل لائبریری دہلی یونیورسٹی

20۔ اس میں بطور مکالمہ محمد اکبر شاہ ثانی کے عہد سے بہادر شاہ ظفر کے حالات بیان کیے گئے ہیں یہ کتاب 1920 میں دہلی سے شائع ہوئی۔

21۔ اس کے آخری حصے میں قلعہ معلی کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب 1937 میں دہلی سے شائع ہوئی۔

22۔ بہادر شاہ ظفر کا پرائیویٹ سکریٹری تھا۔

23۔ اس گھر کو آگ لگ گئی، سید عاشور کاظمی، مترجم سلیم قریشی، مطبع انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی 1993، ص۔ 7

❑❑❑

Dr. Shahnaz Begum
Assistant Professor
3234, Kucha pandit
Lal Kuan
Delhi-110006

ڈاکٹر شاہین فاطمہ

جاوید ناصر خاں

جاوید ناصر 23 فروری 1949 میں پیدا ہوئے۔ انگریزی اور اردو میں ایم۔ اے کیا۔ ابتدا میں کالج کے لکچرر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بعدازاں ریڈیو سے وابستہ ہوئے اور 5 اپریل 2006 میں وفات پائی۔ ان کی تصنیفات میں 'حاصل'، 'تلافی' اور 'تازیانہ' ہیں۔

جاوید ناصر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ ان کے والد اختر الزاں ناصر چونکہ سرکاری ملازمت میں تھے اس لیے ان کے تبادلے ہوتے رہتے تھے اور انھی کے ساتھ ان کا پورا خاندان مختلف مقامات پر منتقل ہوتا رہا چنانچہ جاوید ناصر کی تعلیم کچھ تو اورنگ آباد میں ہوئی کچھ حیدرآباد اور کچھ ناندیڑ میں۔

اختر الزماں خاں کا قیام چونکہ ناندیڑ میں زیادہ رہا اس لیے جاوید ناصر کی طالب علمی کا بیشتر حصہ ناندیڑ میں گزرا، وہیں سے انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بی۔ اے، گورنمنٹ کالج اورنگ آباد سے کیا اور ایم۔ اے انگریزی پیوپلس کالج، ناندیڑ سے کیا۔ اسی اثنا میں وہ مدینۃ العلوم ہائی اسکول، پرتبھا نکیتن کالج ناندیڑ میں درس وتدریس کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ بحیثیت لکچرر جب ان کا تقرر ناتک کالج اورنگ آباد میں ہوا تو وہ اورنگ آباد آئے۔ یہیں سے وہ آکاش وانی کے امتحانی مقابلہ میں شریک ہوئے اس میں کامیابی کے بعد ممبئی ریڈیو اسٹیشن پر بحیثیت پروگرام ایگزیکٹیو ان کا تقرر کیا گیا۔

جاوید ناصر نے کچھ دن احمد آباد، دوردرشن پر بھی کام کیا اور اپنے انتقال سے 3 سال پہلے تک آکاش وانی ناندیڑ پر بحیثیت اسٹیشن ڈائرکٹر کام کرتے رہے۔

جاوید ناصر 1970 کے بعد منظر عام پر آنے والے شعرا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں ہیں۔ نظمیں بھی اور وقتاً فوقتاً ریڈیو کے لیے ڈرامے بھی لکھتے رہے، جدید شعرا میں جاوید ناصر اپنے لہجے کے تیکھے پن اور غیر رسمی انداز بیان کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک تازہ کار لب ولہجہ ملتا ہے۔ ان کا انداز فکر اپنے دیگر معاصرین سے بڑی حد تک مختلف ہوتا ہے۔

چھوٹی بحر خوبصورت پیکر تراشی، قافیہ بندی اور دعائیہ لب ولہجہ اُن کے اشعار میں ایک انوکھی تازہ کار فضا پیدا کرتا ہے۔ قاضی سلیم نے ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے "ہمارے عہد کی پختگی کو کیا کہیے کہ ساری بلاؤں کا نزول اس صدی کے نصف آخری میں ہوا ہے، یہ الفاظ دیگر میرے معاصرین نے جب شعور کی آنکھ کھولی دنیا بستیوں میں تیزی سے اتر رہی تھی۔ پے در پے اعلیٰ اقدار کی شکست اور عقیدہ کی پامالی نے انسان کو اپنی جڑوں سے کاٹ کر بے زمین کر دیا تھا۔ صدی کے آخر تک تو استحصال سیاست اور صارفیت کی حکمرانی نے وہ نوبت پہنچائی کہ ایک خودنگر، ہوس پرست اور دہشت انگیز معاشرہ کی بنیاد استوار ہوگئی۔ جاوید ناصر بچ کر کہاں جاتے۔ اگرچہ اس کشاکش سے وہ راست نبرد آزما کبھی نہیں ہوئے مگر ایک حساس فنکار کی پناہ گاہ کی کھوج میں لگ گئے یہی ان کی عصری حسیت کا

بالواسطہ اظہار ہے۔ان کی شاعری میں کبھی کبھی سرکش روح کی جولانی اور احتجاج کی دبی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے مگر یہ حادثہ خال خال ہی ظہور پذیر ہوتا ہے،ایسے میں اندرونی ٹوٹ پھوٹ بھی دور سے سنائی دیتی ہے۔"

تنگ آ چکے ہیں لوگ مسلسل سکون سے
عالم پناہ، شہر میں اب قتل عام ہو

جاوید ناصر نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا وہ دور اردو ادب میں کئی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا۔ترقی پسند و مقصدی اور دوٹوک انداز کی شاعری بڑی حد تک رد کی جارہی تھی اور آزادی کے بعد کی پیچیدہ صورت حال کے اظہار کے لیے نئے نئے اسالیب تراشے جارہے تھے۔ اسی سلسلے میں زبان کی شکست وریخت اور ہیئت کے تجربوں کی طرف غیر معمولی توجہ دی جارہی تھی۔ پاکستان میں تشکیل زبان اور ردِ تشکیل کے مختلف نظریات کی وجہ سے اردو کے عام انداز بیان کو رد کر کے لفظی صرفی و نحوی تشکیلات میں بڑی حد تک ردو بدل کی کوشش کی جارہی تھی۔

ہندوستان میں 'شب خون'، 'تحریک' اور اسی مزاج کے کچھ رسالوں کی وجہ سے ادب میں نئے نئے اسالیب اور تجربوں کا بول بالا تھا۔ پھر ہمارے نقادوں اور خصوصاً شمس الرحمٰن، وارث علوی اور باقر مہدی کے مضامین کی وجہ سے اردو ادب میں جدید رجحانات بڑی حد تک مستحکم ہو چکے تھے۔لفظوں کا نئے طریقوں سے استعمال، غیر راست اظہار اور انفرادی تجربہ ادب پارے میں غیر معمولی اہمیت کے حامل قرار پاتے تھے۔

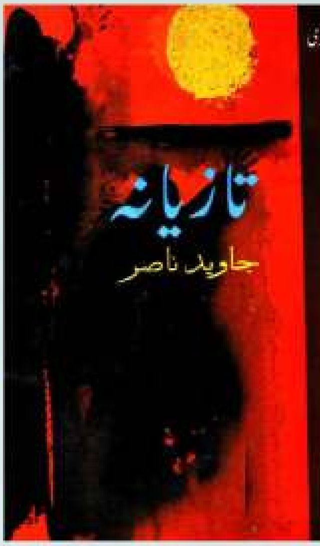

اس زمانے کے نئے لکھنے والوں پر ان تمام باتوں کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ جاوید ناصر نے بھی ان اثرات کو قبول کیا۔اس سلسلے میں کہیں کہیں وہ افراط وتفریط کا بھی شکار ہوئے لیکن اپنے لہجے اور آواز کے تلاش کا عمل جاری رکھا۔ چنانچہ جہاں جہاں وہ افرا تفری میں بچنے سے کامیاب ہوئے ہیں وہاں ان کا لب ولہجہ سادہ، پرکار اور اپنے دوسرے ہم عصروں کے مقابلے میں میادہ تازہ وتوانا نظر آتا ہے۔

انھوں نے نئے نظریات شعروادب کی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ اپنی ذات وشعور میں رچانے وبسانے کی کامیاب کوشش کی۔اس سلسلے میں دکن اور مراٹھواڑہ کی مستحکم ادبی روایت بھی ان کی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

کیونکہ 1956 اور 1970 کے دور میں جدیدیت میں انتہا پسندی آ گئی تھی۔اس کے خلاف وحید اختر، فضیل جعفری اور بشر نواز مسلسل لکھتے رہے تھے اور اتفاق سے ان سبھی کا تعلق سرزمین مراٹھواڑہ سے رہا ہے۔

جاوید ناصر نے جدید ادب سے راہ ورسم پیدا کرنے کے سلسلے میں جہاں شمس الرحمٰن فاروقی اور ان کے ساتھیوں کے نظریات کو پیش نظر رکھا، وہیں اپنے علاقے کے ان قلمکاروں سے بھی مستفید ہوئے۔ چنانچہ ان کی شاعری پر انتہا پسندی اور ادبی توازن کے ملے جلے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

انھوں نے اپنی نظموں میں یقیناً کچھ ناموس اور گنجلک لب ولہجہ اختیار کیا۔ لیکن ان کی غزلوں میں یہ انداز قطعی نہیں ہے۔ اسی لیے باقر مہدی نے لکھا تھا کہ 'جاوید ناصر کا مجموعہ 'تلافی' متنازعہ بن چکا ہے اور جب کوئی شاعر متنازعہ بن جائے تو اسے بار بار پڑھنا چاہیے۔

❑❑❑

Dr. Shaheen Fatema
Bashir Colony
Roshangate
Aurangabad-431001 (M.S)

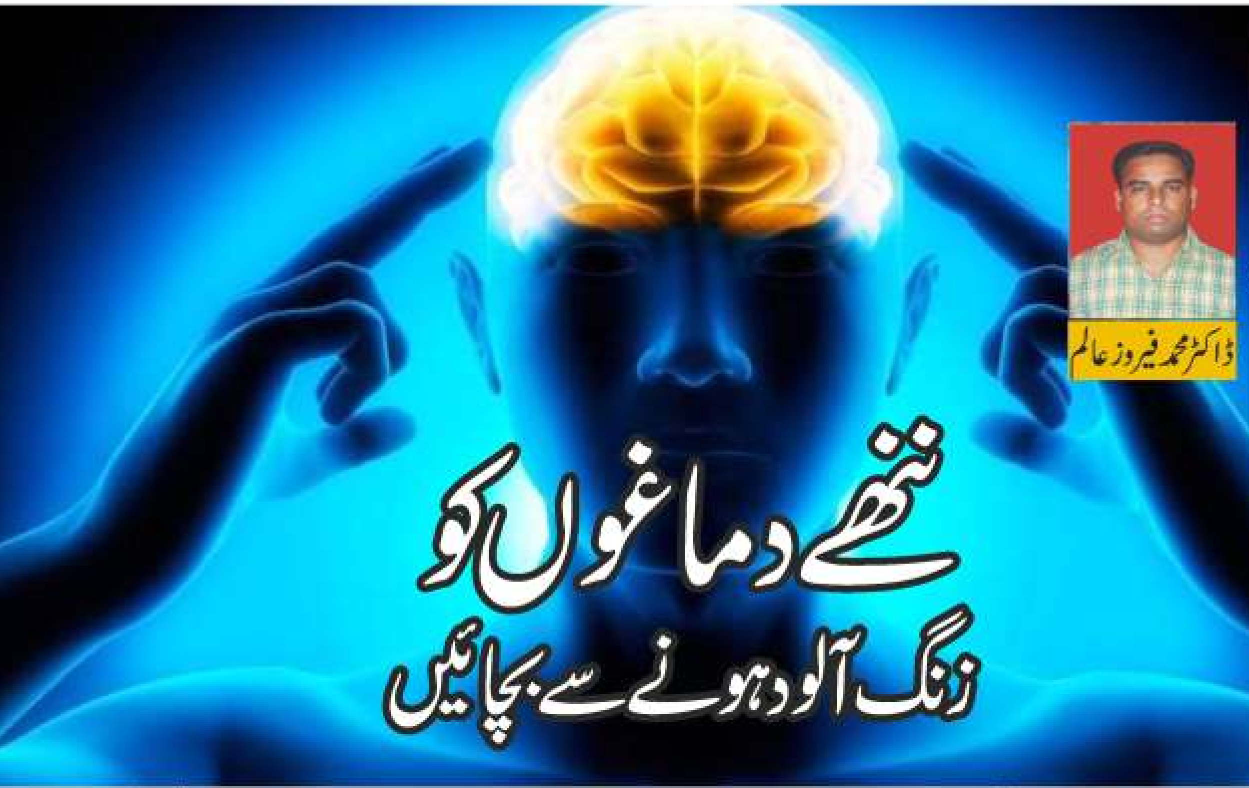

ننھے دماغوں کو زنگ آلود ہونے سے بچائیں

ڈاکٹر محمد فیروز عالم

ہندوستان میں جدید تعلیم کی بنیاد یورپ کے عیسائی مبلغ اور تاجروں کے دست مبارک سے ڈالی گئی۔ انھوں نے اسکول قائم کیے۔ شروع میں مدراس ہی ان کے کام کرنے کی جگہ تھی۔ رفتہ رفتہ کام کے علاقے کی توسیع بھی ہونے لگی۔ ان اسکولوں میں عیسائی مذہب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تاریخ، جغرافیہ، گرامر، ریاضی ، ادب وغیرہ مضمون بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اتوار کو اسکول بند رہتا تھا، کئی اساتذہ طلبا کی پڑھائی مختلف زمرے میں کراتے تھے۔ درس وتدریس کا وقت مقرر تھا۔ سال بھر میں چھوٹی بڑی مختلف تعطیل ہوا کرتی تھی۔ بعدازاں 150 برس گزرتے گزرتے ایسٹ انڈیا کمپنی حکومت کرنے لگی۔ توسیع میں رکاوٹ پڑنے کے ڈر سے کمپنی تعلیم کے سلسلے میں ناپسندیدہ رہی۔ پھر بھی خاص وجہ اور مقاصد کے تحت 1781 میں کلکتہ میں ''کلکتہ مدرسہ'' کمپنی کے ذریعہ اور 1792 میں بنارس میں ''سنسکرت کالج'' بھی قائم کیے گئے۔ تبلیغ کے سلسلے میں کمپنی کی پالیسی بدلنے لگی۔ کمپنی اب اپنے ریاست کے ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کی ضرورتوں کو سمجھنے لگی۔ 1813 کے فرمان کے مطابق تعلیم میں بھی رقم خرچ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کس طرح کی تعلیم دی جائے، اس پر مشرقی اور مغربی تعلیم کے حمایتیوں میں اختلافات رہے۔ بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر میں لارڈ میکالے کی دلیل اور راجہ رام موہن رائے کی حمایت سے متاثر ہوکر 1835 میں لارڈ بینٹک نے فیصلہ کیا کہ انگریزی زبان وادب اور یورپی تاریخ، سائنس وغیرہ کی پڑھائی ہو اور اس میں 1813 کے فرمان کے مدِ نظر منظور شدہ رقم کا خرچ ہو۔ مشرقی تعلیم چلتی رہے، لیکن انگریزی اور مغربی مضمون کے درس وتدریس پر زور دیا جائے۔

آزادی کے بعد رادھا کرشنن آیوگ (1948-49)، سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن (مدالیر کمیشن) 1953، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (1953)، کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن (1964)، نیشنل ایجوکیشن پالیسی (1968) وغیرہ کے ذریعہ ہندوستانی تعلیم سسٹم کو وقت وقت پر صحیح سمت دینے کی بہتر کوشش کی گئی۔

1948-49 میں یونیورسٹیوں کی اصلاح کے لیے انڈین یونیورسٹی کمیشن کا قیام ہوا۔ کمیشن کی سفارشوں کو بہت تیاری کے ساتھ نافذ کیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ پنجاب، گوہاٹی، پونا، روڑکی، کشمیر، بڑودہ، کرناٹک، گجرات، وشو بھارتی، بہار، یادوپور، ولبھ بھائی، کروشیتر، گورکھپور، وکرم، سنسکرت وشوودیالیہ وغیرہ مختلف نئی یونیورسٹیوں کا قیام ہوا۔ آزادی کے بعد تعلیم میں ترقی ہونے لگی جس کی مثال وشو بھارتی، گروکل، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ودیا بھون وغیرہ ہیں۔ 1952-53 میں سکنڈری ایجوکیشن کمیشن نے سیکنڈری ایجوکیشن کی ترقی کے لیے مختلف مشورہ دیے سیکنڈری ایجوکیشن کے تنظیم نو سے تعلیم میں خاص کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن آج کے اس پرآشوب اور تیز ترین دور میں تعلیم کی ضرورت اہمیت کی حامل ہے چاہے زمانہ کتنا ہی ترقی کرلے۔ حالانکہ آج کا دور انفارمیشن ٹکنالوجی کا دور ہے۔ ایٹمی ترقی کا دور ہے، سائنس اور

صنعتی ترقی کا دور ہے مگر اسکولوں میں بنیادی عصری تعلیم، تکنیکی تعلیم، انجینئرنگ، منیجمنٹ، وکالت، ڈاکٹری، پیشہ وارانہ زراعت اور مختلف جدید علوم حاصل کرنا آج کے دور کا لازمی تقاضہ ہے۔

جدید علوم تو ضروری ہیں ہی اس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی بھی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، ساتھ ہی ساتھ انسان کو انسانیت سے دوستی کے لیے اخلاقی تعلیم بھی بے حد ضروری ہے۔ اسی تعلیم کی وجہ سے زندگی میں خدا پرستی، عبادت، محبت، خلوص، ایثار، خدمت خلق، وفاداری اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اخلاقی تعلیم کی وجہ سے صالح اور نیک معاشرہ کی تشکیل ہو سکتی ہے۔

تعلیم کے حصول کے لیے قابل اساتذہ بھی بے حد ضروری ہیں جو بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ استاد وہ نہیں جو محض چار کتابیں پڑھا کر اور کچھ کلاسز لے کر اپنے فرائض سے مبرا ہو گیا بلکہ استاد وہ ہے جو طلبا و طالبات کی مخفی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے اور انھیں شعور و ادراک، علم و آگہی نیز فکر و نظر کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔

جو اساتذہ اپنی اس ذمہ داری کو بہتر طریقے سے پورا کرتے ہیں ان کے شاگرد آخری سانس تک ان کے احسان مند رہتے ہیں۔ اس تناظر میں اگر آج کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ پیشۂ تدریس کو بھی آلودہ کر دیا گیا ہے۔ محکمہ تعلیمات، اسکول انتظامیہ اور معاشرہ بھی ان چار کتابوں پر قانع ہو گیا۔ کل تک حصول علم کا مقصد تعمیر انسانی تھا آج نمبرات اور مارک شیٹ پر ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ صبح و شام کی شفٹ میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ زوروں پر ہے ہر جگہ اور ہر مقام پر تعلیم کو فروغ دینے کی بات کی جاتی ہے۔ جگہ جگہ کوچنگ سینٹر بھی اپنے فرائض کی انجام دہی کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان کوچنگ سینٹر کا ٹرینڈ اس لیے چل پڑا ہے کہ تعلیمی اداروں میں تعلیم دینے کا فقدان ہے۔ گو کہ یہ کوچنگ سینٹر اور نئے نئے تعلیمی ادارے فیس کی مد میں بھاری بھرکم فیس وصول کرتے ہیں جس سے متوسط گھرانے کے بچوں کے والدین بھاری بھرکم فیس برداشت نہیں کر پاتے ہیں جس کی وجہ سے ہونہار بچے اچھی تعلیم سے محروم ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف موجودہ زمانہ دشواریوں کا زمانہ بھی ہے۔ یہ دور خواتین کے لیے صبر آزما اور قربانیوں کا دور ہے۔ پھر بھی خواتین کاوشوں اور ہمتوں سے تعلیم کے قافلے کو آگے بڑھا رہی ہیں اور علم کے ہر شعبہ میں اپنی موجودگی کو یقینی بنا رہی ہیں۔ ان سے یہی امیدیں وابستہ ہیں کہ طالبات کا مستقبل انتہائی تابناک اور کامیاب ہو تا کہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا اثر پوری دنیا پر دکھائی دے۔ اس شعر کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

□□□

Dr. Md Firoz Alam
Jaitpur
New Delhi-110044

ڈاکٹر عرشیہ جبین

شمیم نکہت کے خاکوں کا تنقیدی مطالعہ

شمیم نکہت اردو ادب میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ اپنے زمانے کی مشہور افسانہ نگار ہونے کے باوجود انھوں نے خود کو شہرت و نام و نمود سے دور رکھ کر کئی کہانیاں لکھیں جو اپنے زمانے کے موقر رسائل میں شائع ہوئیں بعد میں کتابی صورت میں ان کا افسانوی مجموعہ'دو آدھے'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کہانیاں ان کی ایک اور تصنیف 'دھند میں چہرے' میں چھپ چکی ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیوں کا مرکز عورت ہے انھوں نے اپنی کہانیوں میں عورتوں کے دکھ درد، ان کی محرومیوں، ان کی تکالیف، ان کی مجبوریوں کے بیان کے علاوہ ہمارے معاشرے کے بے شمار مسائل کو کہانیوں کا روپ دے کر پیش کیا ہے۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ تحقیقی و تنقیدی مضامین اور ریڈیو کے لیے فیچرس بھی لکھے ہیں۔ علاوہ ازیں اردو کی بعض معروف ادبی شخصیات پر ان کے عمدہ خاکے بھی ملتے ہیں۔

ان کے کل 7 خاکے ہیں۔ ''رضیہ سجاد ظہیر'' اور ''صدیقی صاحب'' کے عنوان سے ان کے مضامین کے مجموعے ''تاثرات'' میں دو خاکے شامل ہیں اور پانچ خاکے ''ہاشمی صاحب''، ''قمر صاحب''، ''قمر صاحب کچھ یادیں کچھ باتیں''، عارف نقوی اور استانی جی کے عنوان سے ان کے مضامین کے دوسرے مجموعے ''دھند میں چہرے'' میں شامل ہیں۔ ان کے خاکوں کے مطالعے سے جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کا انداز بیان ہے وہ ایک سلجھی ہوئی اور معتبر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں جس طرح استعاراتی اسلوب اور دلکش زبان قاری کو کرداروں کی زندگی سے قریب کر دیتا ہے اسی طرح ان کے خاکوں کا اسلوب اپنی شگفتگی اور لطافت کی وجہ سے قاری کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور قاری موضوع خاکہ کے ساتھ خود کو اور قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ خوبی ان کے بھی خاکوں میں ملتی ہے۔ خاکے کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی خاکہ کسی بھی شخص پر لکھا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے شخصیت سے متاثر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ انھوں نے بعض ادبی شخصیتوں مثلاً رضیہ سجاد ظہیر، نورالحسن ہاشمی، صدیقی صاحب، عارف نقوی، قمر رئیس پر بڑے دلچسپ اور عمدہ خاکے لکھے ہیں۔ ان کا ایک خاکہ غیر معروف شخصیت پر ملتا ہے جو استانی جی کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ انھوں نے اسی عنوان سے یہ خاکہ لکھا ہے۔ خاکہ عموماً کسی شخصیت سے متاثر ہونے کے بعد ہی لکھا جاتا ہے یا پھر شخصیت سے دیرپا ملاقاتوں کے بعد لکھا جاتا ہے۔

شمیم نکہت کے خاکوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شخصیات سے بے حد متاثر تھیں۔ پہلی ملاقات میں بھی بعض شخصیات بڑا دیرپا تاثر چھوڑ جاتی ہیں۔ شمیم نکہت کی شخصیت سے راقم کا خود گہرا تعلق رہا ہے اسی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ جلد کسی کی شخصیت سے متاثر نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن جن شخصیات نے ان پر گہرا تاثر چھوڑا ان سے وہ گہرا رشتہ یا تعلق رکھتی

تھیں۔ نورالحسن ہاشمی شمیم نکہت کے استاد تھے جن سے وہ بے حد متاثر تھیں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا انھوں نے اپنے خاکے ہاشمی صاحب میں احاطہ کیا ہے۔ان سے اپنی پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثرات کا ذکر انھوں نے اتنے لطیف انداز میں کیا ہے کہ ہم بذات خود ہاشمی صاحب سے ملاقات کرتے محسوس کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً نورالحسن ہاشمی سے ان کی پہلی ملاقات کلاس روم میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنی پہلی کلاس لینے داخل ہوئے تھے اس پہلی ملاقات کا ذکر وہ یوں کرتی ہیں :

''سامنے دروازے سے ایک لطیف جھونکے کے مانند سفید شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس گوری رنگت والے دبلے پتلے مگر باوقار صاحب داخل ہوئے۔ہم سب کھڑے ہوگئے۔ مسکراتے ہوئے ہونٹ ہلے۔ایک اچٹتی ہوئی نظر ہم سب کا جائزہ لیتی ہوئی جھکی اور ہم لوگ بیٹھ گئے ہم سب سے مختصراً تعارف ہوا اور کلاس شروع ہوئی۔کب ختم ہوئی وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ہم سب ولی کے ساتھ محو سفر تھے کبھی گجرات اورنگ آباد کبھی سورت برہانپور۔مکہ مدینہ۔دہلی۔ درمیان میں نہ جانے کتنے اشعار ہماری کاپیوں پر بکھرتے رہے۔انوکھی زبان۔دلکش لہجہ۔ایک خزانہ تھا کہ بکھرتا جارہا تھا۔کلاس ختم ہوا۔تشنگی باقی رہی۔لیکن ۔ہم سب اردو کے ایک بڑے بنیادی شاعر سے متعارف ہو چکے تھے۔ولی دکنی۔ یہ ہمارا پہلا تعارف تھا ہاشمی صاحب سے۔ہم بہت متاثر تھے۔یہ لگا ہی نہیں کہ کلاس میں کوئی ''استاد'' آیا تھا۔کوئی دبدبہ۔کوئی رعب ۔کوئی گرج دھمک۔یاں تو بس لہریں تھیں جو دامن سمیٹ سمیٹ کر گزر رہی تھیں۔ہاں ایک سحر آگیں ماحول ضرور پیدا ہوگیا تھا۔یا ہم نے ہی ایسا محسوس کیا ہو۔''

(شمیم نکہت، ہاشمی صاحب، دھند میں چہرے، مرتبہ رشمہ پروین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2017، ص 68)

شمیم نکہت جس وقت پی ایچ ڈی کے ریسرچ کے سلسلے میں دہلی گئیں تھیں وہاں ان کی ملاقات صدیقی صاحب سے ہوئی جو اس وقت دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں صدر کے عہدے پر فائز تھے۔جب شمیم نکہت ان سے ملاقات کرنے شعبہ اردو میں داخل ہوئیں تو پہلی ملاقات میں وہ ان کی شخصیت کی سادگی، شفقت، ملنساری اور شرافت سے بے حد متاثر ہوئیں اور انھیں تعجب بھی ہوا کیوں کہ اکثر بڑے عہدوں پر ہونے کے بعد شخصیت میں رعب اور دبدبہ خود بہ خود آجاتا ہے اور اکثر اوقات طالب علم

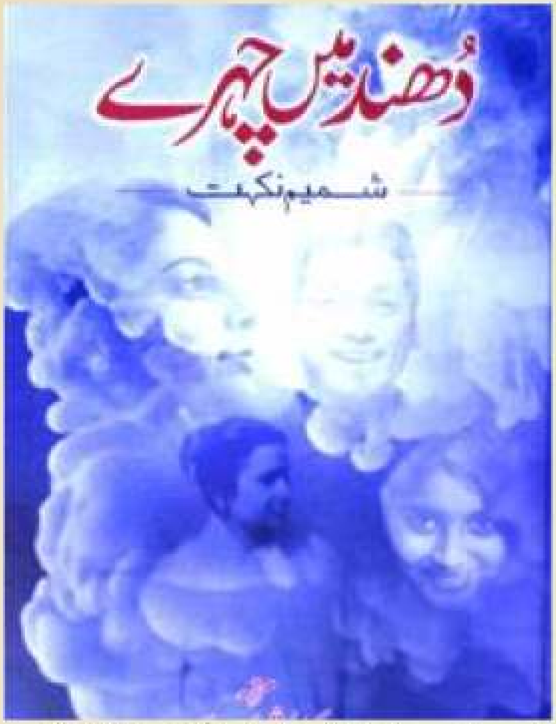

ایسے صدر شعبہ سے خوف بھی محسوس کرتے ہیں شمیم نکہت کی بھی یہی کیفیت تھی جب وہ ان سے ملنے کی غرض سے ان کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس پہلی ملاقات میں ابھرنے والے تاثر کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''مجھے یاد ہے۔میں نے پہلی بار جب ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تھا۔تو وہ ہیڈ کی کرسی پر بیٹھے تھے۔۔۔ہم صدر شعبہ سے ملنے کا خوف دل میں لئے کمرے میں داخل ہوئے۔لیکن یقین جانئے۔جس خوف کے ساتھ ہم نے کمرے میں قدم رکھا تھا۔وہ تو کہیں باہر ہی بھٹک گیا تھا۔اندر تو سامنے بے حد مشفق۔مہربان چہرے والے۔سراپا شرافت ایک صاحب نظر آئے۔ مجھے لگا میرے کوئی عزیز ہیں۔کالی شیروانی ۔گلے تک بٹن ۔سر پر ٹوپی۔سانولا سلونا رنگ۔ستواں ناک۔کشادہ پیشانی۔آنکھیں گہری تو ضرور تھیں۔لیکن کپٹ سے پاک۔شفاف جھیل کے مانند جھل جھل کر رہی تھیں۔یہ سب میں نے چند لمحوں میں محسوس کیا تھا۔

۔۔۔کمرے سے باہر آکر مجھے تعجب ضرور ہوا تھا یہ کیسا ہیڈ ہے؟ ہیڈ تو لگتا ہی نہیں۔ہم نے سن رکھا تھا کہ دہلی کے شعبہ اردو کے ہیڈ فاروقی صاحب جب برآمدے سے گذرتے تھے تو دیواروں پر چیٹیاں ساکت ہوجاتی تھیں

اور ہم اسی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ سے مل کر نکلے تھے۔''

(شمیم نکہت صدیقی صاحب، تاثرات،، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1995، ص 173)

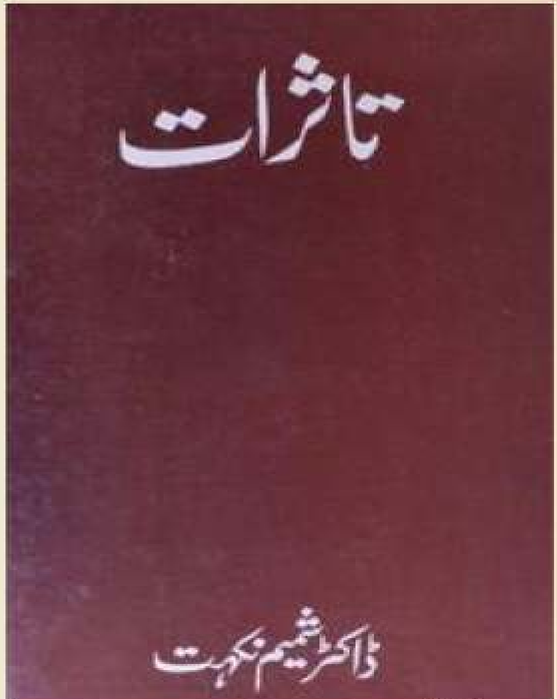

کسی شخص میں نرمی، ملنساری، خلوص، انکساری و شرافت ہو تو ایسی شخصیتیں بہت جلد متاثر کرتی ہیں خاص کر جب وہ بڑے عہدوں پر فائز ہوں لیکن ان میں کسی طرح کا تکبر و رعب و دبدبہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شمیم نکہت صدیقی صاحب سے بہت جلد متاثر ہوئیں اور ان کی مہمان نوازی، خاندانی روایتوں کی پاسداری، کام کی لگن و جستجو، سفر کی عادت، تقریر کی لذت اور بے شمار خوبیوں کا ذکر بھی کیا وہیں ان کی چند خامیوں کو بھی پیش کیا ہے۔

حلیہ نگاری پر شمیم نکہت کو قدرت حاصل تھی وہ ایک اچھی افسانہ نگار تھیں زبان و بیان کی نزاکتوں کا بھی بھرپور احساس رکھتی تھیں اپنے خاکے ''استانی جی'' میں انھوں نے ان کے حلیہ کا بیان اس خوبی سے کیا ہے کہ شخصیت ہو بہو ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتی ہیں:

''سارے محلے میں وہ عام طور پر استانی جی کے نام سے ہی مشہور تھیں۔ سانولی رنگت، اونچا قد، کھڑی ناک اندر کی طرف دھنسی ہوئی۔ لیکن چمکدار آنکھیں۔ ماتھا کچھ اُبھرا ہوا۔ کھچڑی بالوں میں بالکل بیچوں بیچ ہوئی مانگ۔ سیاہی مائل ہونٹ۔ جن کے درمیان چمکتے ہوئے موتی جیسے دانت۔ اور پھر ان کا ٹھہرا ٹھہرا بولنے کا انداز۔ ان کی شخصیت کے اہم جزو تھے۔ وہ باہر نکلتیں تو سر سے پیر تک سفید برقع اوڑھے ہوتیں۔ پھر بھی دور سے پہچان لی جاتیں۔''

(شمیم نکہت، استانی جی، دھند میں چہرے، مرتبہ ریشمہ پروین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2017، ص 99)

اس اقتباس سے انجانی شخصیات سے بھی ہمارا بھرپور تعارف ہوتا ہے۔ استانی جی ایسی ہی شخصیت ہے جن سے ہماری شناسائی نہیں ہے لیکن ان کے اس بھرپور حلیہ نگاری کے ذریعے انھوں نے ان کی نہ صرف شخصیت سے ہمارا تعارف کرایا ہے بلکہ شخصیت اپنے تمام سراپے کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

انھوں نے اپنے ایک عزیز دوست عارف نقوی جو جرمنی میں مقیم ہیں پر ایک عمدہ خاکہ لکھا ہے جو ان کی کتاب ''دھند میں چہرے'' میں شامل ہے۔ اس خاکے میں انھوں نے عارف نقوی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ خصوصاً اس عہد کی ادبی شخصیتوں اور ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے اس عہد کے نوجوانوں کے عزائم اور ان کی فکر کا بڑی عمدگی سے احاطہ کیا ہے۔ عارف نقوی سے پہلی ملاقات اور ان کے حلیے کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور فکر کا یوں بیان کیا ہے کہ عارف نقوی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہمارے سامنے آجاتا ہے مثلاً:

''لکھنؤ یونیورسٹی کی بلڈنگ میں ایک برجی میں کھڑی ہم دو تین لڑکیاں ہنگامہ مچاتے ہوئے الیکشن کے دیوانے لڑکوں کو دیکھ رہے تھے جو غول در غول سڑک پر سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔ کہ اچانک پشت سے کھڑبڑاہٹ کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک خوبصورت سا نوجوان لڑکا مٹھی میں مونگ پھلی دبائے ہونٹوں پر سوکھے چھلکے چپکے۔ مونگ پھلی وہ بغیر چھلے کھا رہا تھا۔ ہم لوگوں سے مخاطب تھا۔ دیکھئے آپ لوگ ووٹ رابن مترا کو ہی دیجئے۔ آپ لوگ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟۔ دیکھئے۔ دیکھئے بھولئے گا نہیں۔ آیئے گا ضرور۔ یونین بلڈنگ میں۔ قریب ہی تو ہے۔ اس نے جلدی جلدی کہا اور ہوا کے جھونکے کے مانند غائب کہ شمیم انھوں نے جو میرے کلاس فیلو تھے فوراً وارد ہوئے۔ بولے یہی ہیں عارف نقوی اور گردن ہلاتے ہوئے بولے ان کو پڑھنے لکھنے سے کوئی مطلب نہیں کامریڈ ہیں۔ بھئی۔ کامریڈ۔ اور زور دار قہقہہ۔ تم پوچھ رہی تھیں نا۔ دیکھ لیا حلیہ۔ اور میں سوچنے لگی۔ محمد حسن کے ڈرامے ''میر'' کا میر اور کرشن چندر کے ڈرامے

سرائے کے باہر کا فقیر ہیں۔ عارف نقوی۔"
(شمیم نکہت، عارف نقوی، دھند میں چہرے، مرتب ریشمہ پروین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2017،ص33)

عارف نقوی چوں کہ کامریڈ تھے کیوں اس عہد کے اکثر نوجوانوں کی طرح ان کی شخصیت پر بھی ترقی پسند تحریک کے گہرے اثرات تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں بھی غریبوں کے دکھ درد اور تکلیفوں کا ذکر کیا ہے خصوصاً انسانی دردمندی و ہمدردی کی وجہ سے وہ سبھی کے بہت اچھے دوست بن جاتے اور اپنی دوستی کو ایک اچھے دوست کی طرح ہمیشہ نبھاتے رہے۔ ان کی شخصیت کے انھیں اجزا کو شمیم نکہت نے ان کے اس خاکے کے حوالے سے پیش کیا ہے۔

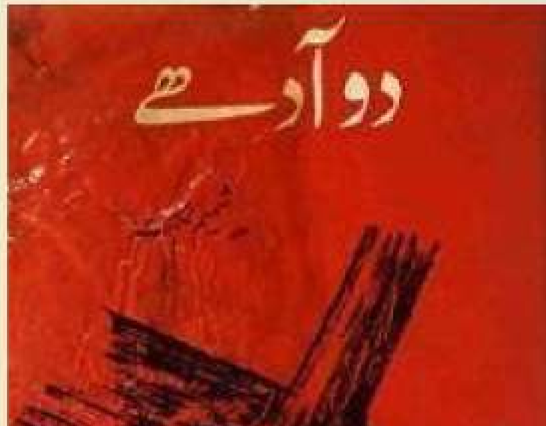

"قمر صاحب کچھ یادیں۔ کچھ باتیں" بھی شمیم نکہت کا ایک اہم خاکہ ہے اس خاکہ میں انھوں نے قمر رئیس کے ساتھ گذرے لمحات، ان کی حلیہ نگاری، مہمان نوازی، ان کی عادتوں اور مشاغل کے ذکر کے ذریعے ان کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس خاکے میں ان کی حلیہ نگاری، بچوں جیسی معصومیت، ملنساری، مسکراہٹ اور سنجیدگی اور قہقہہ دار ہنسی کا تذکرہ عمدگی سے کیا ہے چنانچہ قمر رئیس کی حلیہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

"ان کا صاف شفاف چمکتا ہوا چہرہ۔ جس پر کبھی کبھی سرخی جھلک آجاتی تھی۔ اجڑے بکھرے گھنے بال۔ گہری گہری بولتی ہوئی آنکھیں جن میں اکثر کہانیاں بھی تیرتی نظر آتیں۔ مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ جیسے ابھی۔ بس ابھی کوئی سُر پھوٹنے والا ہے۔ اور جب سنجیدہ ہو کر کبھی غور کرنے لگتے تو۔ دور۔ بہت دور ان کی دونوں آنکھیں تلاش میں کھو جاتیں۔ بچوں میں ایسے مل جاتے جیسے اپنے بچپن کو تلاش لیتے۔ میں نے تو ان کو اپنی بہت چھوٹی بہنوں کے ساتھ ڈسکو کرتے بھی دیکھا ہے۔ وہ پوچھتے اس ڈانس کو کیا کہتے ہیں۔ آج کھا۔ ڈسکو۔ اور خوب قہقہے سے ہنس دیتے۔"
(شمیم نکہت، قمر صاحب: کچھ یادیں، کچھ باتیں، دھند میں چہرے، مرتبہ ریشمہ پروین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2017،ص90)

قمر صاحب شمیم نکہت کے شعبہ کے ساتھی استاد بھی تھے اور ان کے پڑوسی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دوسرے کے گھر اکثر ان لوگوں کا آنا جانا ہوتا اور تبادلہ خیال بھی رہتا اور خلوص و محبت کا رشتہ روا رہتا تھا۔ قمر رئیس کو مذاق کرنے کی عادت تھی ایک واقعہ کے حوالے سے انھوں نے ان کے مذاق کرنے کی عادت کا ذکر یوں کیا ہے:

"ڈپارٹمنٹ میں ہم لوگ تقریباً 35 سال ساتھ رہے۔ بہت سی کھٹی میٹھی یادیں ذہن میں مچل رہی ہیں۔ ایک بار کا واقعہ بیان کروں۔ قمر صاحب ہیڈ تھے۔ ڈپارٹمنٹ میں صدیقی صاحب، فریدی صاحب اور کئی لوگ بیٹھے تھے۔ میں کلاس لے کر آئی اور ہیڈ کی کرسی کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ تھوڑی خاموشی تھی۔ پھر قمر صاحب نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔ بولے۔ شمیم صاحبہ کل ہمارے کمرے کے سامنے جو اسٹوڈنٹس کا ہنگامہ ہوا تھا۔ وہ آپ کی مرضی سے ہوا تھا۔ مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ ہنگامہ کیا ہوا تھا۔ میں نے حیرت سے فوراً جواب دیا قمر صاحب۔ آپ سے کس نے کہا۔؟ میرا لہجہ ذرا سخت تھا لیکن قمر صاحب مسکرا رہے تھے، میں نے پھر دوبارہ پوچھا قمر صاحب نام بتایئے، کیا صدیقی صاحب نے کہا۔؟ میں کسی اور کا نام نہیں لینا چاہتی تھی۔ میرے چہرے کا رنگ تمتما گیا تھا۔ میرا سوال سنتے ہی سب لوگ ہنس دیے۔ ارے آپ تو ناراض ہو گئیں۔ ہم لوگ دیکھ رہے تھے کہ آپ پر کیا جچے گی۔ میرا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ قمر صاحب نے

چائے منگوائی اور ہم لوگوں نے چائے پی، کچھ دیر کمرے میں ٹھہرے اور اپنی اپنی طرف چلے گئے۔''

(شمیم نکہت ،قمر صاحب کچھ یادیں ،کچھ باتیں ،دھند میں چہرے ،مرتبہ ریشمہ پروین ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی 2017،ص 92)

شمیم نکہت نے قمر رئیس کے حلیہ اور ان کی عادتوں کے ذریعے ان کی زندہ دلی اور خوش مزاجی جیسی صفات کی نشاندہی کی ۔ پڑوسی ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے کے گھر شام کی چائے پر شرکت کرنا اور دعوتوں کا اہتمام کرنا جیسے معاملات کے ذریعے دوستی اور دوستی کو نبھائے رکھنے کی ان کی اچھی صفت کا تذکرہ بھی اس خاکہ کے ذریعے ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں شخصیات کی مہمان نوازی جیسی صفات کا ذکر بھی بہترین انداز میں کیا ہے مثلاً صدیقی صاحب کی مہمان نوازی کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی شرافت اور مہمانوں کے ساتھ حسن سلوک کا اچھا محاکمہ کر کے ان کی شخصیت کی اس خوبی کی ستائش کی ہے:

''اب ان کے گھر میں دھوپ آئے یا نہ آئے۔ آنگن چھوٹا ہو یا بڑا۔ ذرا نیچے دروں سے جھانک کر دیکھئے۔ گھر ہے یا مہمان خانہ۔ یا یوں کہئے پردیسیوں کی جائے پناہ۔ نہ صوبے کی قید۔ نہ رشتے کی ۔ نہ چھوٹے کی نہ بڑے کی کوئی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا زبانی امتحان لینے آیا ہے تو کوئی ۔ ایم۔ فل کا۔ کوئی میٹنگ میں آیا ہے۔ تو کوئی خریداری کرنے ۔ کسی کو علاج کرانا ہے۔ تو کوئی اپنے بچوں کا رشتہ طے کرنے آیا ہے۔ کسی کو اندرا گاندھی ایرپورٹ جانا ہے۔ اور غضب تو کبھی یہ ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کو ڈرائیوری کا کام بھی انجام دینا پڑتا۔ اب ان کے سارے بچے ایک ہی کمرے میں سمٹ جائیں۔ یا ان کی ''کپھل بی'' (خادمہ) بیماری کا بہانہ کر کے چل دیں۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر کی چہل پہل میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ بلکہ کونے کونے میں برکت ہی نظر آئے گی۔''

(شمیم نکہت ،صدیقی صاحب ،تاثرات ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی ،1995،ص 176)

صدیقی صاحب کے اس اقتباس نہ صرف ان کی مہمان نوازی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کی شرافت اور حسن اخلاق کا بھی علم ہوتا ہے۔ شمیم نکہت نے ایک خاکہ استانی جی کے عنوان سے لکھا ہے جو غیر معروف شخصیت ہے ۔اس خاکے میں انھوں نے استانی جی کی نیکی ، شرافت، پاکیزگی اور ایمانداری جیسی صفات کے تذکرے کے ذریعے ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو وا کرنے کی کوشش کی ہے۔

''شمیم نکہت کے خاکوں میں شخصیت سے بھرپور تعارف بھی ہوتا ہے وہ موضوع خاکہ کی شخصیت کے مختلف پہلوئوں کے ذریعے ان کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ مثلاً رضیہ سجاد ظہیر کو انھوں نے قریب سے دیکھا تھا وہ ان کی استاد تھیں جن کے یہاں ان کا آنا جانا بھی تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت کے بعض اہم گوشوں پر انھوں نے بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے کہ رضیہ سجاد ظہیر کی وضع داری ، خلوص و محبت، صبر و تحمل اور ان کی تہذیب و شائستگی کی چلتی پھرتی تصویریں ہماری نظروں میں رقص کرتی محسوس ہوتی ہیں''

شمیم نکہت کے خاکوں میں شخصیت سے بھرپور تعارف بھی ہوتا ہے وہ موضوع خاکہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے ذریعے ان کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ مثلاً رضیہ سجاد ظہیر کو انھوں نے قریب سے دیکھا تھا وہ ان کی استاد تھیں جن کے یہاں ان کا آنا جانا بھی تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت کے بعض اہم گوشوں پر انھوں نے بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے کہ رضیہ سجاد ظہیر کی وضع داری ،خلوص و محبت ،صبر و تحمل اور ان کی تہذیب و شائستگی کی چلتی پھرتی تصویریں ہماری نظروں میں رقص کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ مثلاً رضیہ سجاد ظہیر کے یہاں صبر و تحمل کا مادہ تھا وہ خاندانی شرافت اور شائستگی کا دامن کسی بھی ناگواری کے عالم میں بھی تھامے رکھتی تھیں اور کبھی کوئی بات ناگوار محسوس ہوئی تو ان کے چہرے کے تاثرات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا کہ وہ غصے میں ہیں۔ چنانچہ ان کی شخصیت کے اس پہلو کو پیش کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''ان کی زندگی تو خود ایک کتاب تھی ۔۔۔ کھلی ہوئی کتاب ۔۔۔ جس کی ہر سطر اچھائی ۔۔۔ نیکی ۔۔۔ ہمدردی اور محبت کے چکیلے حروف سے سجی تھی۔ لیکن ان حروف پر اگر کبھی کسی نے کوئی ضرب لگا دی۔ تو اونچے چکیلے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ چہرہ سرخ ہو جاتا۔ ہونٹوں کے دونوں گوشے سکڑ جاتے۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر نہ رہتی کبھی کبھی یہ ناگواری الفاظ کا جامہ بھی پہن لیتی۔ لیکن بس وقتی ۔۔۔ ہاں ان کا اعتماد اگر ایک بار کسی پر سے اٹھ جاتا ۔۔۔ تو غالباً وہ جگہ

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خالی ہو جاتی ۔۔۔ میں نے خود کئی حضرات کو دیکھا ہے جن سے رضیہ آپا کو سخت تکلیف پہنچی تھی ۔۔۔ لیکن وہ اتنی وضعدار تھیں ۔۔۔ اتنی مہذب تھیں ۔۔۔ کہ ایسے لوگ بھی جب کبھی گھر آجاتے تو بڑے تحمل سے ان کی باتیں سنتیں ۔۔۔ اور کبھی ناگواری کا اظہار نہ کرتیں ۔۔۔ سوائے اس کے کہ ان کے چلے جانے کے بعد بڑی اکتاہٹ سے کہتیں ۔۔۔ لاؤ بونا ایک سگریٹ اور اٹھادو ۔۔۔ بڑے بور ہو گئے ۔۔۔ شاید یہ ان کی سب سے بڑی سزا تھی جو وہ خود کو دے سکتی تھیں۔"

(شمیم نکہت، رضیہ سجاد ظہیر، تاثرات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1995، ص 182)

شمیم نکہت نے رضیہ سجاد ظہیر کی شریف النفسی اور شائستگی کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ شخصیت سے ہمارا بھرپور تعارف ہو جاتا ہے۔ انھوں نے صرف ان کے شخصی پہلوؤں پر ہی روشنی نہیں ڈالی بلکہ رضیہ سجاد ظہیر کی عادتوں اور ان کی پسند ناپسند کا ذکر بھی عمدگی سے کیا ہے۔ ان کے خاکوں کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے موضوعِ خاکہ سے اپنی عقیدت کی بنا پر انھیں بڑھا چڑھا کر ان کی تعریفیں نہیں کی بلکہ جو شخصیت انھیں جیسی نظر آئی اس کی ہو بہ ہو تصویر پیش کر دی ہے۔ شمیم نکہت خود اپنی ذاتی زندگی میں بڑی بے باک اور صاف گو واقع ہوئی ہیں اپنے ساتھیوں میں وہ کھرا بولنے والی خاتون مانی جاتی ہیں۔ وہ اپنی استاد سے عقیدت کی بنا پر حقائق سے پردہ پوشی نہیں کرتیں بلکہ ان کی عادتوں کے ذریعے ان کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں کی بھی ہو بہ ہو عکاسی کرتی ہیں۔ مثلاً سجاد ظہیر کی خوشبو لگانے کی عادت ہو یا پان کھانے یا سگریٹ نوشی کا ذکر وہ یوں کرتی ہیں:

"خوشبودار پھولوں اور ہندوستانی خوشبوؤں کی عاشق۔ پان کھانے کی شوقین۔ لیکن سگریٹ عادت کے تحت پیتیں۔ اور کبھی عادت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتیں۔ ہاں کلاس میں کبھی سگریٹ نہیں پی۔ کلاس میں آنے سے پہلے ایک لمبا سا کش لے کر سگریٹ کو دور پھینک دیتیں۔"

(شمیم نکہت، صدیقی صاحب، تاثرات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1995، ص 183)

غرض اس خاکے میں ان کے تحفے و تحائف دینے کی عادت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس خاکے کے ذریعے نہ صرف رضیہ سجاد ظہیر کی شخصیت سے بھرپور واقفیت ہوتی ہے بلکہ اس عہد کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ مثلاً رضیہ سجاد ظہیر کے مکان پر ترقی پسند تحریک کی پرزور میٹنگ کا ذکر ہو یا پھر اسٹوڈنٹس کا اپنے اساتذہ کے ہمراہ ترقی پسند تحریک میں شرکت ہونا اور تحریک کو باعمل بنانے کی باتیں بھی کچھ ان کے خاکوں کے ذریعے پتہ چلتا ہے۔ شمیم نکہت نے جس طرح اپنے خاکے میں رضیہ سجاد ظہیر کی کمزوریوں پر نگاہ رکھی ہے یعنی ان کی پان کھانے کی عادت اور سگریٹ نوشی کی عادت کے ذریعے ان کی کمزوریوں کو پیش کیا ہے وہیں غیر جانبداری سے نورالحسن ہاشمی کے سفر سے کترانے کی عادت کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتی ہیں:

"ہاشمی صاحب سفر سے بے حد گھبراتے ہیں۔ ہمیشہ ان کو زبردستی ڈپارٹمنٹ میں بلایا جاتا۔ ان کو کئی کئی خط جاتے، ٹالتے رہتے لیکن فاروقی صاحب ان کو گھیر ہی لیتے۔ اور جب دہلی پہنچ جاتے تو بہت خوش ہوتے کہ سب سے ملاقات ہو گئی۔"

(شمیم نکہت، ہاشمی صاحب، دھند میں چہرے، مرتبہ ریشمہ پروین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017، 69)

شمیم نکہت کے تمام خاکوں کے مطالعہ سے شخصیت سے نہ صرف بھرپور تعارف ہوتا ہے بلکہ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے ہم شخصیت سے پہلے سے واقف ہیں اور ہماری ان سے دیرینہ شناسائی ہے کیوں کہ وہ جس شخصیت پر خاکہ لکھتی ہیں اس کی خامیوں اور خوبیوں، اس کی پسند ناپسند، اس کی عادتوں، اس کے مشاغل اور مختلف واقعات کے ذریعے شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ شخصیات کی حلیہ نگاری، کردار نگاری اور ان کی شخصیت کی مختلف صفات جیسے مہمان نوازی، شریف النفسی، ملنساری، منکسر المزاجی، انسان دوستی، احسان شناسی، صبر و تحمل، وضعداری و تہذیب و شائستگی کا ذکر غیر جانبداری سے کرتی ہیں کہ شخصیت اپنے مکمل خدوخال کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ زبان و بیان پر بھی شمیم نکہت کو بھرپور قدرت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے خاکوں میں بڑے لطیف و شگفتہ اسلوب کے ذریعے موضوعِ خاکہ سے متعلق اپنے تاثرات کا بیان کیا ہے۔ غرض شمیم نکہت کے خاکے نہ صرف شخصیت سے ہمارا بھرپور تعارف کراتے ہیں بلکہ ایک لطیف احساس سے بھی گذارتے ہیں ساتھ ہی اپنے عہد کی ادبی سرگرمیوں تحریکوں اور شخصیتوں سے بھی ہمیں متعارف کراتے ہیں۔ ☐☐☐

Dr. Arshia Jabeen
Associate Professor
Dept. of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046 (T.S)

نثار رحمٰن

ادب کی خواتین نوبیل انعام یافتگان

نوبیل انعام الفریڈ نوبیل کے نام سے منسوب ہے۔ ان کا تعلق سویڈن کے خاندان نوبیلیس سے تھا۔ جن کا پیشہ کاشتکاری تھا۔ اس خاندان کا ایک فرد فوج میں داخل ہوگیا اور اس نے اپنا نام نوبیل رکھ لیا۔ اس طرح اب اس خاندان کا نام نوبیلیس کی جگہ نوبیل ہوگیا۔ الفریڈ کے والد کا نام ایمانوئیل اور والدہ کا کیرولین ہنریٹیا آئیسل تھا۔ الفریڈ چار بھائی تھے۔ ان کی تعلیم تو کوئی خاص نہ تھی مگر ان کو نئی ایجادات کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر کوئی نہ کوئی چیز بنانے میں مصروف رہتے تھے۔

الفریڈ نوبیل 21/اکتوبر 1833 کو اسٹاک ہام میں پیدا ہوئے۔ وہیں ان کی تعلیم کا آغاز ہوا جو اعلیٰ پیمانے پر نہ ہوسکی۔ تاہم وہ ذاتی کوششوں سے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھ گئے تھے اور جرمن، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں اچھی مہارت حاصل ہوگئی تھی۔ انھوں نے اپنی کوششوں اور جدید ایجادات سے اچھی خاصی رقم اکٹھی کرلی تھی اور شہر کے امیر لوگوں میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ انھوں نے اپنی دولت کو کسی اچھے مصرف میں خرچ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اس کے تحت ان کے ذہن میں انعام کا خیال آیا جو ان کے نزدیک ان کی رقم کا بہترین مصرف ہوسکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی خاندانی شناخت کی نسبت سے ''نوبیل انعام'' کا اعلان کیا جس کے اصول وضوابط اور قواعد وشرائط بھی انھوں نے متعین کیے۔ ان کے وصیت نامے میں تحریر ہے کہ:

''جو دولت میں نے جمع کی ہے۔ اس سے ایک انعام ہر پانچویں سال دیا جائے۔'' اس انعام کے زمرے اس طرح ہوں گے۔

1۔ علم کیمیا میں اہم تحقیق پر
2۔ علم طبیعیات میں اہم تحقیق پر
3۔ علم الاجسام اور علم الادویہ میں تحقیق پر
4۔ کسی ادبی موضوع پر تحقیق کے لیے
5۔ اتحاد باہمی اور عالمی قیام امن کے لیے

اس انعام کو سویڈش سائنس اکیڈمی کی ایک خاص کمیٹی کے ذریعے دیا جائے گا جس کے پانچ ممبر ہوں گے۔ جن کو ناروے کے ایٹارنگ کمیٹی منتخب کرے گی۔ انھوں نے اپنے وصیت نامے میں یہ بھی تحریر کیا۔ ''میری آرزو یہ ہے کہ انعامات تقسیم کرتے وقت امیدواروں کی قومیت یا نسل و ذات کا لحاظ نہ کیا جائے۔ انعام اسی کو دیا جائے جو اس کا حقیقی مستحق ہو خواہ وہ ان کے وطن اسکینڈی نیویا کا باشندہ ہو یا نہ ہو۔ ان انعامات کے مستحق کے انتخاب اور ان کے تقسیم کرنے کا طریقہ کچھ اس طرح ہے۔ ہر سال ستمبر کے مہینے میں ہر ایک مضمون کی علاحدہ علاحدہ کمیٹیاں ان لوگوں کو جو امیدواروں کے نام پیش کرسکتے ہیں مطلع کرے گی مگر وہ اپنے علم و دانست کے مطابق ان افراد کے نام پیش کریں جو اس کے مستحق قرار دیے جاسکتے ہیں۔

اس انعام کو تقسیم کرنے کے لیے 10/دسمبر کو اسٹاک ہام میں ایک بڑا جلسہ کنسرٹ ہال میں منعقد کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر سویڈش اکیڈمی کا کوئی ممبر انعام یافتہ کا حاضرین سے تعارف کراتا ہے۔ اس کے بعد اس کو انعام کے طور پر انعامی رقم کا چیک، طلائی تمغہ، اور ڈپلومہ پیش کرتا ہے۔ جس میں ان وجوہات کا ذکر ہوتا ہے جن کی وجہ سے یہ انعام اس کو دیا گیا۔

اسی تحریر میں اس کی کسی خاص تصنیف کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔

خواتین بھی ہمارے سماج کا اہم حصہ ہیں اور وہ مردوں سے کسی بھی میدان میں پیچھے نہیں رہی ہیں۔ ان انعامات کو حاصل کرنے میں وہ بھی شریک رہی ہیں۔ اپنے موضوع کے مطابق ایسے ہی کچھ خواتین کا ذکر سطور ذیل میں کیا جارہا ہے۔ جو اس باوقار انعام کی مستحق قرار دی گئیں اور انھوں نے یہ انعام حاصل کر کے اپنے ملک وقوم کا نام اونچا کیا۔ اور خود اپنی ذات کو بھی لازوال بنالیا۔

1۔ سلیما لاگرلاف:

ان کا پورا نام سلیما اوئی لیانا لوولیا لاگرلاف تھا۔ ان کی ولادت 30/نومبر 1858 کو سویڈن میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام اے رک لاگرلاف اور ماں کا لوویسا والراتھ تھا۔ ساڑھے تین سال کی عمر میں فالج کی وجہ سے ان کی ایک ٹانگ زندگی بھر کے لیے بیکار ہوگئی۔ وہ کتابوں کی بہت

شوقین تھیں۔ اس وجہ سے انھوں نے گھر پر ہی ایک لائبریری قائم کر رکھی تھی۔ وہ نثر ونظم دونوں لکھنے پر قدرت رکھتی تھیں۔ ان کی نظمیں اور ڈرامے شائع ہوکر مقبول ہو چکے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک معلمہ تھیں۔ پھر وہ معلمہ کا عہدہ چھوڑ کر مختلف ممالک کی سیاحت پر نکل گئیں جہاں جا کر انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

ان کی اعلیٰ کارکردگی پر 1904 میں ان کو سویڈش اکیڈمی کی جانب سے طلائی تمغہ دیا گیا۔ 1904 میں ایسالا یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ 1909 میں انھیں نوبیل انعام سے سرفراز کیا گیا جس کے بعد وہ سویڈش کی ممبر منتخب ہوئیں وہ اس اکیڈمی کی پہلی خاتون ممبر تھیں۔ 1911 میں انھوں نے قوانین کے بین الاقوامی حق رائے دہی کنونشن میں حصہ لیا تھا۔ 1939 میں وہ بیمار ہوگئیں۔ تقریباً ایک سال بیمار رہ کر 16/مارچ 1940 کو پیریٹونائٹس کی وجہ سے ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر 81 سال 5 ماہ کی تھی۔

سلیما کی پہلی کتاب میں سویڈن کی زندگی کی عکاسی ہے۔ 1894 میں ان کی دوسری تصنیف ''مرئی رشتے'' شائع ہوئی۔ اس میں سلیما نے زندگی کی مختلف شکلوں میں روحانیت کا اظہار کیا ہے۔ 1897 میں ان کی مذہبی کتاب ''معجزاتِ دجال'' شائع ہوئی۔ اس کے دو سال بعد 1899 میں ''سویڈن کی دیہی حویلی'' نام سے ان کی چوتھی کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔ ان کی تحریروں میں بڑی سادگی اور بلا کی سلاست ہے۔ ان کو نوبیل انعام کمیٹی نے اس اعتراف کے ساتھ انعام سے نوازا:

> ''ان کے اعلیٰ آدرشوں، بلند خیالی، شفاف تصورات اور روحانی احساسات کے لیے جو ان کی تصانیف کی صفات ہیں۔ انھیں انعام دیا جاتا ہے۔''

2۔ گریزیا ڈلیڈا:

ان کی پیدائش اٹلی کے سارڈینیا جزیرے کے ایک چھوٹے سے

گاؤں میں 1875 میں ہوئی تھی۔ان کے والد نے اگرچہ قانون کی تعلیم حاصل کی تھی۔مگر پیشہ کے طور پر انھوں نے کاشتکاری اور تجارت کو اپنایا۔ ان کے شوہر کا نام پال مرینو مڈیسائی تھا جو لومبارڈی کے رہنے والے تھے۔ ان کی گھریلو زندگی نہایت عیش و آرام میں بسر ہوئی۔1936 میں 61/ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

گریزیا نے اپنی تخلیقات میں اپنے وطن سارڈینیا کے باشندوں، وہاں کے رسم ورواج اور لوک کہانیوں کا ذکر بڑی خوبی اور حسین انداز میں کیا ہے۔ان کی کتاب ''ہوا میں نرکل'' خود ان کو بہت پسند تھی۔انھوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ اپنی ہی تسلی اور ذہنی سکون کے لیے لکھا۔اس لیے ان کا قول ہے۔

''دلی سکون مقدم ہے، قارئین کی تعریف اور کامیابی کی باری تو بعد میں آتی ہے۔''

گریزیا کے قلم میں بڑی جان تھی۔ان کی نثر کو نظم سے بلند مرتبہ تسلیم کیا گیا ہے۔ان کے یہاں گھریلو زندگی کا حقیقی اور روح پرور نقشہ کھینچا گیا ہے۔انھوں نے اپنی تحریروں سے دنیا کے اس پہلو کو ابدی زندگی بخشی ہے۔1907 میں ان کو نوبیل انعام دیتے وقت متعلقہ اکیڈمی نے ان کے متعلق کہا تھا:

''مہارت اور آدرش واد سے بھرپور ان کی تخلیقات کے لیے جو غیر محسوس بنا دینے کی مہارت کے ساتھ ان کے اپنے جزیرے کی زندگی کو پیش کرتی ہیں اور گہری ہمدردی سے پوری انسان برادری کے مسائل کا نہایت ہمدردانہ تجزیہ کرتی ہیں۔''

3۔سگرید انڈسٹ:

ان کی پیدائش 20/ مئی 1882 کو کیلنڈیارگ (ڈنمارک) میں ہوئی۔ان کے والد کا نام انگوالا مارتن اندست تھا۔جو ماہر آثار قدیمہ تھے۔ ان کی نگرانی میں انھوں نے ناروے کی تاریخ کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ان کی تعلیم کرسٹیانا مرکنٹائل کالج میں ہوئی تھی۔انھوں نے اپنے والد کے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیے۔والد کے ساتھ رہ کر انھیں تاریخ کی اچھی سدھ بدھ حاصل ہوگئی تھی۔1911 و 1912 کے درمیان ان کی شادی ہوئی ان کے شوہر کا نام اے سی سورسٹڈ تھا جو ایک اچھا آرٹسٹ تھا۔ اسی دوران وہ رومن کیتھولک عیسائی ہوگئیں۔1940 میں 58/سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

آئس لینڈ کی قدیم داستانوں کو مشعل راہ بنا کر سگرید نے 1930 میں اپنی سب سے اہم اور متاثر کن ناول ''کرسٹین لورانس ڈاٹر'' تخلیق کی۔ اس کا شمار ناروے کے عظیم ناولوں میں ہوتا ہے۔اس ناول نے تکنیکی اور فنی خوبیوں کی بنا پر بین الاقوامی ادب میں اپنا مخصوص و نمایاں مقام بنالیا ہے۔ ان کی یہ خصوصیات قابل تحریر ہیں کہ وہ ناول کے کرداروں کو اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ بنا کر ہی انھیں اپنی تخلیقات میں جگہ دیتی ہیں۔یہی خوبی ہے جس کی بنا پر ان کے کردار جیتی جاگتی تصویر بن جاتے ہیں۔ان کی ابتدائی تصانیف میں ان لڑکیوں کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے جو دفتروں میں کام کرتی ہیں۔جن کی نامساعد حالات کی وجہ سے بے جوڑ شادی ہو جاتی ہے اور پھر وہ زندگی بھر یاس و ناامیدی کا سامنا کرتی ہیں۔ان کی تخلیق ''جینی'' ایسے ہی حالات کا نقشہ پیش کرتی ہے۔اس کتاب کی خوبیاں انگنت ہیں۔ اور اسی کتاب نے ان کو ساری دنیا میں شہرت عطا کی۔ان کی یہ کہانی سگرید کی تمام تخلیقات میں بہتر و عمدہ تسلیم کی گئی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ ان کے یہاں رومانیت نہیں ہے۔انھوں نے اپنی اکثر تخلیقات میں محبت و رومانیت کو پیش کیا ہے۔اسی کے ساتھ ہی ان کی تاریخی تخلیقات بھی بہت مشہور ہوئیں۔ان کی سب سے اہم اور عظیم تخلیق ''کرسٹن لورانس واٹر'' ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ان کو انعام کا مستحق قرار دیتے ہوئے اکادمی کے ذمہ داران نے کہا:

''ان کی تخلیقات بالخصوص قرونِ وسطیٰ میں شمالی ممالک کی زندگی کی حقیقی تصویریں پیش کرنے پر انھیں یہ انعام دیا جاتا

ہے۔''

4۔ پرل بک:

پرل بک کے آباؤ و اجداد جرمن، ڈچ اور فرانسیسی تھے جو مشنری ہونے کی وجہ سے ایک جگہ مقیم نہ رہتے تھے اور نقل مکانی ان کی زندگی کا حصہ تھا۔ پرل کی پیدائش 26/جون 1882 کو ہلس بورو (مغربی ورجینیا) میں ہوئی۔ ان کا بچپن چین کے چن کیانگ شہر میں گذرا۔ سات سال کی عمر میں انھوں نے چارلس ڈکنس کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس سے

انھیں انگلستان سے محبت ہوگئی۔ انھوں نے متعدد اداروں اور مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کی۔ 1917 میں انھوں نے 25/سال کی عمر میں ایک عیسائی مشنری ''جان لاسنگ بک'' سے شادی کر لی۔ 1922 میں انھوں نے مضامین لکھنا شروع کیے 1923 میں ان کا پہلا مضمون ''اٹلانٹک'' رسالے میں شائع ہوا۔ ایک سال بعد دوسری کہانی ''ایسٹ وِنڈ ویسٹ وِنڈ''، ''ایشیا'' رسالے میں شائع ہوئی۔ 1931 میں ان کی تصنیف ''دی گڈ ارتھ'' شائع ہوئی۔ اس کتاب پر ان کو پولٹزر انعام ملا۔ اس کتاب کا بہت سی ادبی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے جو اس کی بے پناہ مقبولیت کی دلیل ہے۔

1935 میں پرل بک نے اپنے شوہر سے طلاق لے کر رچرڈ جے والش سے شادی رچالی جو ایک اشاعتی ادارے کے مالک تھے۔ پھر انھوں نے ہی پرل کی تخلیقات شائع کیں۔ 1933 میں ان کو قبیل یونیورسٹی نے ایم اے کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ 1936 میں یہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس لائف اینڈ لیٹرس کی ممبر بن گئیں اسی دوران انھیں کچھ اور بھی اعزاز حاصل ہوئے۔ ان کا کہنا تھا:

''ہم عجیب انسان ہیں۔ کیوں کہ حقیقت میں جب تک ہم ناول نہ لکھیں ہمیں آرام نہیں مل سکتا۔''

6/مارچ 1973 کو کیلی فورنیا، امریکہ میں ان کا انتقال ہوا۔

1938 میں انھیں نوبیل دیتے ہوئے سویڈش اکیڈمی نے کہا تھا:

''چین کے کسانوں کی حقیقی زندگی کی عظیم شاعرانہ تصویر کشی کے لیے۔ انھیں یہ انعام دیا جاتا ہے۔''

5۔ گیبریلا مسترال:

ان کا اصل نام ''لوسیلا گڈ اے وائی الکایا گا'' تھا۔ 7/اپریل 1889 میں ان کی پیدائش کووکونا نام کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام ''جیرون کا گڈ اے ویلا لیوالیو'' اور والدہ کا ''پٹرولنا الکایا گا'' تھا۔ ان کے آباؤ اجداد ہسپانوی بلسک اور امریکہ کے سرخ ہندوستانی تھے۔ ان کے والد ایک گاؤں میں ٹیچر تھے۔ مسترال کی ابتدائی تعلیم ان

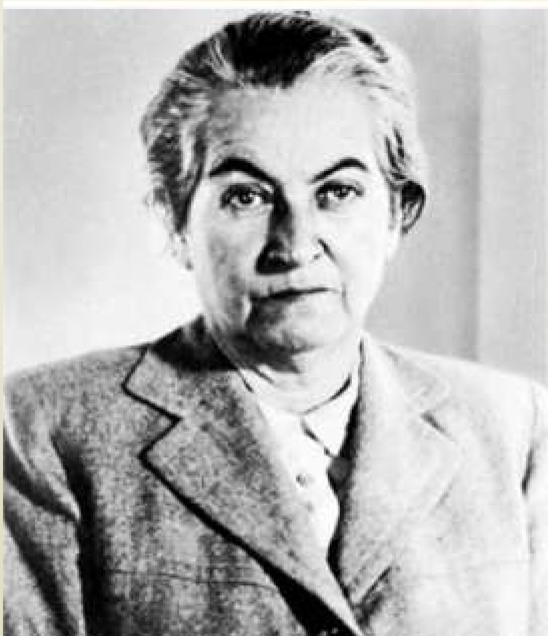

کے گاؤں میں ہی ہوئی۔ 22/سال کی عمر میں انسپکٹر آف اسکول ہو گئیں۔ پھر چھ سال کے بعد ''لیسلوڈیلاس لینڈیز'' میں پروفیسر ہو گئیں۔ 1918 سے 1922 تک یہ تین اسکولوں میں ہسپانوی زبان کی ڈائریکٹر بھی رہیں۔ 1931 میں برمارڈ کالج میں ہسپانوی تاریخ اور ادب کی پروفیسر ہو کر امریکہ چلی گئیں۔ 1933 میں میڈرڈ میں چلی کی قونصل ہو کر گئیں۔ اسی طرح یہ نرین، جینوا اور نیلپس بھی گئیں۔ جہاں مختلف عہدوں پر فائز رہ کر علم وادب کی خدمت کرتی رہیں۔ 10/جنوری 1957 کو 68/سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

انھوں نے کم عمری میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ 1907 میں شائع ہونے والی ان کی نظم ''لاواز ڈے الگی'' سے ان کی خاصی شہرت ہوئی۔ 1914 میں ان کی تین نظمیں ''موت کے سانیٹ'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوئیں۔ جن پر ان کو انعام سے نوازا گیا۔ 1922 میں ان کی کتاب ''ڈیسیلون'' اسپینش انسٹی ٹیوٹ سے شائع کی گئی۔ یہ انجیل، ٹیگور اور میکسکو کے مصنف ''ماڈابزوؤ'' اور نکاراگوا کے ''روبن ڈاریو'' سے کافی متاثر رہیں۔

ان کی نظموں کی حقیقی قوت سلاست اور ان کی بلندیٔ تخئیل ہے۔ ان کے یہاں اکثر ایسی نظمیں ہیں جو پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتی ہیں۔ دراصل یہ نظمیں تخلیق اور قاری کے مابین ایک ایسا جذباتی رشتہ پیدا کر دیتی ہیں جو گہرا بھی ہوتا ہے اور لازوال بھی۔ حقیقت میں یہی ان کا فنی کمال ہے اور کمالِ فن کی معراج بھی۔ ان کو نوبیل انعام کا مستحق قرار دیتے ہوئے اعتراف کیا گیا۔

''ان کے منظوم گیتوں کے لیے جو پر جوش جذبات سے معمور ہیں اور جنھوں نے ان کے نام کو تمام جنوبی امریکہ کی دنیا کی مثالی تمناؤں کی شکل دے دی ہے۔ انھیں یہ انعام دیا جا رہا ہے۔''

6۔ نیلی شاخت:

ان کی ولادت 10/دسمبر 1891 کو برلن میں ہوئی ان کی پہلی تخلیق ''روایات و حکایات'' 1921 میں شائع ہوئی 1940 میں ہٹلر کی مخالفت کی وجہ سے ان کو جرمنی چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ پھر وہ سویڈن جا کر آباد ہو گئیں۔ جرمنی سے منتقلی کے وقت ان کی کچھ تخلیقات بھی ضائع ہو گئیں۔ انھوں نے سویڈش شاعری کا جرمنی میں ترجمہ کیا۔ انھیں جنگ نے بہت صعوبتیں دی تھیں پھر بھی ان کی تخلیقات میں تلخی اور غم کے عناصر بہت کم ہیں۔ غم زدہ اور بے سہاروں کی مدد کرنا وہ فرض عین سمجھتی تھیں۔

ان کی تخلیقات پر انھیں متعدد بین الاقوامی اعزاز سے نوازا گیا۔ وہ پہلی یہودی خاتون تھیں جن کو نوبیل انعام تفویض کیا گیا۔ انھوں نے شادی نہیں کی۔ اسٹاک ہوم میں 79 سال کی عمر میں 14/مئی 1974 کو وہ مالک حقیقی سے جا ملیں۔

انھیں نوبل انعام کا حقدار قرار دیتے ہوئے سویڈش اکیڈمی نے کہا تھا

''ان کی اعلیٰ ترنم ریز اور ڈرامائی تخلیقات کے لیے جن میں انھوں نے اسرائیل کے تعصب کا بیان پر زور الفاظ میں کیا ہے۔ انھیں یہ انعام دیا جاتا ہے۔''

سطور بالا میں ہم نے جو معلومات پیش کی ہیں اس سے اچھی طرح واضح و مترشح ہوتا ہے کہ خواتین کسی بھی میدان میں مردوں سے پیچھے نہیں رہی ہیں اور انھوں نے اپنی صلاحیت و خدمات کی بنیاد پر وہ انعام و اعزاز حاصل کیے ہیں جو دنیائے انسانی کی عظمتوں کی معراج ہے۔

Sana Rahman
Principal
Allama Iqbal Modern Public School
Miyan Sarai
Sambhal-244302 (U.P)

سوشل میڈیا اور
طلبہ کی جسمانی و ذہنی صحت

مومن سمیہ

ہم اس دور میں سانس لے رہے ہیں جہاں چاروں طرف معلومات کا سمندر ہے اور معلومات صرف ایک بٹن کی دوری پر ہے۔ پچھلے کچھ سالوں میں سوشل میڈیا نے حیرت ناک طور پر اور تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے اور دنیا بھر کے لاکھوں صارفین کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

عام طور پر سوشل میڈیا کے معنی انٹرنیٹ پر کمپیوٹر یا موبائل فون کے ذریعے کسی بھی انسانی مواصلات (پیغام) یا معلومات کا تبادلہ ہے۔ متعدد ویب سائٹس اور ایپلی کیشن ہیں جو اس کام کو انجام دیتے ہیں۔ آج سوشل میڈیا مواصلات کا سب سے بڑا ذریعہ بن گیا ہے جو کافی تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ سوشل میڈیا ہمیں تیز رفتاری سے مواد، خیالات اور معلومات کے تبادلے کے اہل بناتا ہے۔ آج کل سوشل میڈیا کا استعمال اتنی کثرت سے ہو رہا ہے کہ اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

جسمانی طور پر ایک دوسرے سے دور ہونے کے باوجود دنیا کی تقریباً آدھی آبادی سوشل میڈیا کے ذریعے جڑی ہوئی ہے اور لوگ باہم استفادہ کر رہے ہیں۔ دور دراز کے علاقوں میں مقیم افراد، خاندان، رشتے دار اور دوست واحباب کے درمیان دوری کی دیوار کو ختم کر کے سوشل میڈیا نے کم سے کم اخراجات میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

سوشل میڈیا، میڈیا کی جدید ترین شکل ہے جس میں بہت ساری خصوصیات ہیں۔ سوشل میڈیا، انٹرنیٹ پر مبنی ایپلی کیشن کا سیٹ ہے جو صارفین کو معلومات و مواد کی تخلیق و تبادلے کے ساتھ ساتھ خیالات اور اظہارِ رائے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پیغام بھیجنے، تصاویر کو شیئر کرنے، آڈیو اور ویڈیو کالس کرنے اور پوری دنیا سے منسلک ہونے جیسی سہولتیں بھی فراہم کرتا ہے۔

مختلف ماہرین نے سوشل میڈیا کو مختلف طریقے سے بیان کرنے کی کوششیں کی ہیں (حالانکہ لغوی طور پر اکوئی خاص تعریف نہیں ہے)۔ میریم ویبسٹر ڈکشنری کے مطابق سوشل میڈیا الیکٹرانک کمیونٹی کی ایک شکل ہے جس کے ذریعے صارفین آن لائن کمیونٹی بناتے ہیں تا کہ وہ اپنے خیالات و احساسات، معلومات، ذاتی پیغامات اور دیگر مواد (آڈیو اور ویڈیو) لوگوں سے شیئر کر سکیں۔ اینڈرسن (2005) نے سوشل میڈیا کو کافی وسیع بتایا ہے، جس میں ای۔میل اور SMS کے پیغامات بھی شامل ہیں۔ منوچا (2009) کے مطابق سوشل میڈیا لوگوں اور گروہوں کے درمیان مواصلات اور نیٹ ورکنگ کی اجازت دیتی ہے جہاں گروپ کے ممبران، گروپ کی سرگرمیوں کے بارے میں اپ ڈیٹ رہتے ہیں اور حسبِ ضرورت وسائل و معلومات کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔

PEW (2017) کی ایک تحقیق کے مطابق پوری دنیا کی آبادی کے 37٪ لوگ سوشل میڈیا کا استعمال کرتے ہیں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان میں مردوں کے مقابلے خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔ نوجوان نسل میں یہ تناسب تقریباً یکساں ہے۔ پچھلے پانچ سالوں میں فیس بک، واٹس اپ اور گوگل+ کے استعمال میں صارفین کی تعداد میں معنی خیز اضافہ ہوا

ہے۔انٹرنیٹ پر موجود حقائق اور اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں سن 2015 میں سوشل میڈیا کے صارفین کی تعداد تقریباً 142 ملین ہے جو سن 2019 کے آخر تک 350 ملین ہو جائے گی۔سن 2023 تک یہ تعداد بڑھ کر 447 ملین ہونے کا امکان ہے۔

سوشل میڈیا کے استعمال کے اثرات:

ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ سوشل میڈیا کے استعمال نے ہماری زندگی کو آسان تر بنا دیا ہے۔گھر بیٹھے ہم دنیا کے حالات جان سکتے ہیں، کسی بھی موضوع (Topic) پر معلومات حاصل کر سکتے ہیں، دنیا کے کسی بھی کونے میں کسی بھی شخص سے بات کر سکتے ہیں۔آن لائن شاپنگ اور بزنس بھی کر سکتے ہیں، ویڈیو بنا کر شیئر کر کے سماجی مسائل کے تعلق سے

لوگوں میں شعور و بیداری پیدا کر سکتے ہیں، تعلیمی گروپ بنا کر علمی مواد کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔لیکن جس طرح سکے کے دو رخ ہوتے ہیں اسی طرح سوشل میڈیا کے بے جا استعمال سے منفی اثرات بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ سوشل میڈیا کا سب سے زیادہ اثر اگر کسی نسل پر ہوا ہے تو وہ نوجوان نسل ہے۔اسی لیے سوشل میڈیا آج مختلف تنازعات کا موضوع بھی بنا ہوا ہے۔کچھ لوگوں کو لگتا ہے کہ یہ ایک نعمت ہے جبکہ لوگوں کی ایک بڑی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ یہ ایک مسئلہ اور زحمت ہے۔متعلقہ مواد کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زیادہ تر لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ سوشل میڈیا کی وجہ سے انسانی تعامل و سماجی تعلقات میں کمی آئی ہے۔ لوگ اس کے اسیر ہو گئے ہیں۔اپنے روزمرہ کے کاموں کو نظر انداز کر کے سوشل میڈیا پر وقت بتاتے ہیں۔طلبہ کی تعلیمی کارکردگی سے لے کر ان کے عادات و برتاؤ پر بھی اثر ہوا ہے۔کچھ مطالعات میں یہ بھی سامنے آیا کہ سوشل میڈیا کے بے جا استعمال سے نوجوان نسل بے چینی اور دباؤ کا شکار ہو رہی ہے۔نوجوان سماجی معاشرے سے کٹ کر رہ گئے ہیں اور تنہائی کا شکار ہو گئے ہیں۔بہت سارے سماجی جرائم ہونے لگے ہیں جیسے سائبر کرائم، دھوکہ دہی، ذاتی معلومات کی ہیکنگ وغیرہ۔

طلبہ کی جسمانی و ذہنی صحت پر سوشل میڈیا کے اثرات:

صحت کسی بھی جسم کی فعالی و استحالی (functional and metabolic) کارکردگی کی سطح ہے۔صحت انسانی زندگی کی وہ کیفیت ہے جو بہترین طریقے سے زندگی گزارنے اور روزمرہ کے کاموں کو انجام دینے کے لیے ضروری ہے۔ماحول کے ساتھ جسمانی، ذہنی، نفسیاتی اور سماجی تبدیلیوں کا سامنا کرتے وقت خود کو منظم کرنے کے لئے اچھی صحت کا ہونا ضروری ہے۔

WHO کے مطابق:

"Health is a state of complete physical, mental and social well-being and not merely the absence of disease or infirmity."

(محض بیماری اور کمزوری سے پاک ہونا صحت نہیں ہے بلکہ صحت طبعی، ذہنی اور سماجی لحاظ سے عمدگی کی کیفیت ہے۔)

اچھی جسمانی صحت کے معنی صرف سنگین بیماریوں یا جسمانی کمزوریوں سے پاکی ہی نہیں ہے بلکہ اس کے دائرے میں کسی بھی قسم کی جسمانی تکلیف کا نہ ہونا بھی شامل ہے۔صحت کے دائرے میں جسمانی صحت کی مرکزی اہمیت نظر آتی ہے اس کے علاوہ اس میں سماجی، دانشورانہ، جذباتی اور روحانی صحت بھی شامل ہے۔اسی طرح ذہنی صحت، نفسیاتی

صحت کی سطح اور ذہنی بیماری کی غیر موجودگی اور ذہنی تازگی کی کیفیت ہے۔ایک فرد کو ذہنی طور پر صحت مند تب ہی کہہ سکتے جب وہ اپنی روزمرہ کی زندگی کو نہ صرف عمدگی اور خوشی و مسرت کے ساتھ بلکہ ایک متوازن طور پر گزارے گا۔(UK Surgeon Journal (1999 کے مطابق ذہنی صحت ذہنی افعال کی کاماب کارکردگی ہے جس کے تجہط مس رمعنی خز9 سرگرمازں انجام پاتی ہس ن، دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات بنتے ہیں اور مصبوزں سے نمٹنے کی قابلیت وصلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ایک فرد ذہنی طور پر اس وقت پریشان ہوتا ہے جب وہ کسی تذبذب کا شکار ہوتا ہے یا قنوطیت، اکیلے پن کسی قسم کے ذہنی تناؤ میں مبتلا ہوتا ہے۔

تیز رفتار زندگی اور ٹکنالوجی کی بدولت آج اکثر لوگ کسی نہ کسی جسمانی و ذہنی تکلیف سے دوچار ہس ی۔ کسی کو زندگی میں کم وقت میں زیادہ پیسے کمانے کی فکر ہے۔کوئی بے روزگاری کی وجہ سے پریشان ہے تو نوجوان نسل اور طلبہ اپنی پڑھائی اور نوکری کے لیے فکرمند ہیں۔دورِ حاضر میں دیکھا جا رہا ہے کہ افراد بقا کے لیے صحت پر دھیان نہ دے کر اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اگر اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت نکال بھی لیتے ہیں تو ٹکنالوجی کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔صحت کے متعلق کیے گئے ایک مطالعے میں یہ بات سامنے آئی کہ نوجوان نسل سردرد، آنکھوں میں درد، فکرمندی و الجھن، ذہنی کشمکش و دباؤ اور افسردگی میں زیادہ مبتلا ہیں۔سوشل میڈیا کے زیادہ استعمال نے ان تکالیف میں مزید اضافہ کیا ہے۔

سوشل میڈیا کا استعمال اور طلبہ کی جسمانی و ذہنی صحت کے درمیان ہم رشتگی:

سوشل میڈیا کے استعمال اور طلبہ کی جسمانی و ذہنی صحت پر اس کے اثرات اور ان کے درمیان رشتے کو جاننے کے لیے محققین نے شہر حیدرآباد میں یونیورسٹی طلبہ پر تحقیقی کام انجام دیے ہیں۔اس تحقیق کے مقاصد طلبہ کے درمیان سوشل میڈیا کے استعمال کی سطح کو معلوم کرنا، طلبا و طالبات کے درمیان سوشل میڈیا کے استعمال کے اوسط اسکور کا موازنہ کرنا، سوشل میڈیا کے استعمال اور طلبہ کی جسمانی و ذہنی صحت کے درمیان ہم رشتگی کو معلوم کرنا تھا۔اس تحقیق سے یہ بات ابھر کر سامنے آئی ہے کہ طلبہ اوسط سے زیادہ سوشل میڈیا کا استعمال کرتے ہیں اور دن بھر میں اوسطاً چار سے پانچ گھنٹے سوشل میڈیا پر صرف کرتے ہیں اس میں ویڈیو کی ڈاؤن لوڈنگ اور پڑھائی کے متعلق مواد کا تبادلہ زیادہ کرتے ہیں۔طلبا و طالبات کے درمیان سوشل میڈیا کے استعمال کے اوسط اسکور میں معنی خیز

فرق پایا گیا ہے۔حاصل ہونے والے معطیات کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ طلبا کے مقابلے طالبات سوشل میڈیا کا استعمال زیادہ کرتی ہیں۔ سوشل میڈیا کے استعمال اور طلبہ کی جسمانی و ذہنی صحت کے درمیان منفی اور مضبوط ہم رشتگی پائی گئی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ طلبہ سوشل میڈیا کا استعمال جتنا زیادہ کریں گے ان کی جسمانی و ذہنی صحت اتنی ہی متاثر ہوگی۔نتائج کے مزید تجزیہ سے معلوم ہوا کہ سوشل میڈیا ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے سے طلبہ میں سردرد، آنکھوں میں خارش، نیند میں کمی، سستی اور ذہنی دباؤ جیسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

مطالعے کے نتائج سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ سوشل میڈیا کا بڑھتا استعمال نہ صرف ہماری پیداواریت (productivity) کو متاثر کر رہا ہے بلکہ صحت کے متعلق بنیادی مسائل بھی پیدا کر رہا ہے جس کی وجہ سے ہمارے روزمرہ کے کاموں میں خلل پیدا ہو رہا ہے۔ چنانچہ مذکورہ مسائل سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی صحت کو قیمتی سرمایہ جانتے ہوئے اس کی حفاظت کریں اور اپنے بیش بہا اوقات کو برباد نہ کرتے ہوئے متوازن طور پر سوشل میڈیا کا استعمال کریں۔خاص طور پر خواتین اپنی صحت کا زیادہ دھیان رکھیں کیونکہ آنے والی نسل کی حفاظت اور فروغ کی ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوتی ہے۔ایک بچے کا پیدائشی حق نہ صرف پڑھی لکھی بلکہ جسمانی و ذہنی اور جذباتی طور پر صحت مند ماں کا ہونا بھی ہے۔جسمانی و ذہنی طور پر صحت مند فرد پرجوش اور ہشاش بشاش نظر آنے کے ساتھ ساتھ اپنی قابلیت اور صلاحیت کا بھی صحیح استعمال کرے گا اور اپنے اطراف و اکناف کے ماحول اور افراد کے ساتھ

مطابقت اور ہم آہنگی قائم کرے گا جس سے اس کے سماجی تعلقات بھی بہتر ہوں گے۔

کتابیات:

Al-Rahmi, W., & Othman, M.(2013). The impact of social media use on academic performance among university students: A pilot study. Journal of information systems research and innovation, 4(12)1-10.

Chauhan, S.S.(2013).Advanced Educational Psychology. Noida: Vikas Publishing House Pvt. Ltd.

https://en.wikipedia.org/wiki/Health

https://en.wikipedia.org/wiki/Mental_health

https://en.wikipedia.org/wiki/Social_media

https://www.statista.com/statistics/278414/ number-of-worldwide-social-network-users/

Koul, L(2013) Methodology of Educational Research. New Delhi: Vikas Publishing House.

Primack, B. A, Shensa, A, Escobar-Viera, C. G, Barrett, E. L.,Sidani, J. E, Colditz, J. B. James, A. E.(2017).Use of multiple social media platforms and symptoms of depression and anxiety: A nationally-representative study among US young adults. Computers in human behaviour, 69,1-9.

Shabir, G Hameed, Y. M. Y Safdar, G.,Gilani, S. M. F. S. (2014). The Impact of Social Media on Youth: A Case Study of Bahawalpur City. Asian Journal of Social SciencesHumanities, 3(4) 132-151.

□□□

Momin Sumaiya

Plot No. 141,Ground Floor,

Road No. 7,Street No. 24,

Telecom Nagar, Gachibowli

Hyderabad-500032 (Telangana)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................... بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

صوفیہ محمود

صالحہ عابد حسین

کے افسانوں میں سماجی و طبقاتی شعور

صالحہ عابد حسین اردو کی ان خواتین ادیبوں میں سے ہیں جو بیک وقت ناول نگار، افسانہ نویس اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ ان کا اصل نام مصداق فاطمہ تھا وہ 18 اگست 1913 کو پانی پت میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد 'خواجہ غلام الثقلین' اپنے دور کے جید عالم، مصلح اور رسالہ 'عصر جدید' کے مدیر تھے۔ ان کی والدہ مولانا الطاف حسین حالی کی پوتی تھی اور علم و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتی تھیں۔ خواجہ غلام السیدین ان کے بڑے بھائی تھے اور ڈاکٹر عابد حسین ان کے شوہر۔

مصداق فاطمہ (صالحہ عابد حسین) نے بہت کم عمری سے ہی لکھنا شروع کردیا تھا اور یہ سلسلہ تا حیات چلتا رہا۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ تقریباً پچاس (50) سے زائد کتابوں کی مصنفہ ہے۔ ان کے نو ناول اور کم و بیش چھ افسانوی مجموعے 'نقش اول'، 'ساز ہستی'، 'نراس میں آس'، 'نو نگے، درد و درماں اور تین چہرے تین آوازیں کے علاوہ سوانح نگاری، خودنوشت سوانح نگاری، سفرنامہ، ڈائری، ریڈیو پر بات چیت کا مجموعہ، مرثیہ، ادبی مضامین، تنقیدی مضامین اور خاکے کے علاوہ ادب اطفال پر بھی کتابیں تحریر کی ہیں۔

صالحہ عابد حسین زندگی کے نشیب و فراز اور حرکت و عمل پر گہری نظر رکھنے والی ادیبہ تھیں۔ انھوں نے زندگی کے حرکت و عمل میں انسانی سماج اور تاریخ کے رد عمل سے پیش آنے والی تبدیلیوں کو بیان کرنے کا بھی ہنر جانتی تھیں۔

افسانہ نگاری سے رغبت ان کی اپنی چاہت و لگن کا ثمرہ تھا وہ ایک حساس اور دردمند دل ادیبہ تھیں ان کی شخصیت ایک دانشور، مشہور مترجم اور نقاد کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔ ان کے جذباتی رد عمل کا اثر کبھی بھی نعرہ بازی، احتجاج اور ہنگامے کی طرف راغب نہیں ہوا بلکہ ان کے مزاج کی نفاست ہمیشہ قوم و ملت کے اظہار کے لیے موزوں وسیلہ بنی رہی۔

صالحہ عابد حسین ادب برائے زندگی کی قائل تھیں وہ ادب کو صرف تفریح طبع اور وقت گزاری کا وسیلہ نہیں سمجھتی تھیں بلکہ ادب کو حقیقی زندگی کا ترجمان مانتی ہیں۔ اس لیے صالحہ عابد حسین کی نظر میں افسانہ نگاری صرف فن کاری نہیں بلکہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کا ترجمان اور اس کو پیش کرنے کا فنکارانہ وسیلہ ہے۔

صالحہ عابد حسین نے معاشرتی زندگی کے تلخ حقائق و واقعات کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے افسانوی ادب میں سمویا ہے۔ ان کی کہانیاں زندگی کی بے راہ روی، سماجی، نفسیاتی اور خانگی حالات پر مبنی ہیں۔ سماج میں رونما ہونے والے مسائل مثلاً خانگی حالات، بوڑھے بزرگوں کی ناقدری، قدیم و جدید تہذیبی قدروں کا ٹکراؤ، مغربی اصولوں کی اندھی تقلید وغیرہ صالحہ کے فن کے موضوع رہے ہیں۔ ان کی کہانیاں ان کے حالات کی منظر کشی کرتی ہیں۔ جس کا براہ راست تعلق ہمارے سماج، معاشرے اور متوسط طبقات سے ہوتا ہے جو قاری کے لیے غور و فکر کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ہم عصروں کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے انھوں نے تخیل پرستی اور رومانیت پسندی سے خود کو دور رکھا۔ انھوں نے اپنے نظریہ ادب کو کسی مخصوص فکر اور فلسفہ کے تابع نہیں بنایا۔

15 اگست ہندوستان کی آزادی کا دن، آزاد ملک کی حقیقت، دہلی کا فساد، یوم آزادی کے جشن کے فوراً بعد، ستمبر میں! دہلی کی رواداری، خوبصورت عمارتیں، کتب خانے، درس گاہ، قابل قدر ادارے، سب کے سب تباہ کیے جا رہے تھے۔ غموں اور دکھوں کی مسلسل یلغار نے ہر حساس دل کو صدمے سے نڈھال کر دیا تھا۔ مصنفہ جو ذاتی غم اولاد کی محرومی کو دور کرنے کی غرض سے معاشرے کے دکھ درد کو اپنایا اور اسے اپنے اولاد کی طرح سمجھی، اس کی پرورش و پرداخت، سجانے وسنوارنے میں پر خلوص ادبی خدمت کا عزم بلند کیا لیکن اس خونی مناظر نے تباہ و برباد کر دیا، ادب سے والہانہ عقیدت اس بات کی دلیل ہے۔ ذیل کا فقرہ ملاحظہ فرمائیں:

''اولاد سے آخر ماں کیا توقع کرتی ہے نام چلنے کی؟ کیا اس کی تصانیف اس کا نام باقی نہ رکھیں گی؟ رفاقت کی؟ کیا کتابوں سے بڑھ کر کوئی رفیق ہو سکتا ہے بڑھاپے اور مصیبت میں دستگیری کی؟ مالی منفعت کی؟ کیا اس کی کتابیں اسے یہ فائدہ نہیں پہنچا سکیں؟'' (نراس میں آس۔ص 90)

افسانہ 'نراس میں آس' کو سوانحی افسانہ کہا جائے تو بجا نہ ہوگا، پوری کہانی مصنف کی ذاتی زندگی کا عکس لگتی ہے۔ کم عمری سے چھپ چھپا کر لکھنے پڑھنے کا شوق پھر بھائی اور شوہر کی مدد سے ذوق ادب کا پروان چڑھنا، عورت کی زندگی کے حسین لمحات ماں بننے کا خواب، اپنے بچے کے لیے سپنے سجانا، پھر اس سپنے کا چور چور ہو کر بکھر جانا، درد و غم کے مناظر ہر واقعات کو تحریروں میں جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اولاد کی تشنگی کو دور کرنے کے لیے پوری محنت و لگن کے ساتھ ادب کی خدمت میں لگ جاتی ہے، اور اسے فرضی اولاد تصور کرتی ہے۔ مصیبت میں صبر ہی تو مومن کی پہچان ہے!

صالحہ عابد حسین ایک ایسی ادیبہ ہیں جو خود کو اپنے ذاتی حصار میں قید کرنے کے بجائے معاشرتی برائیوں کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سیاسی، سماجی اور تاریخی واقعات کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تحریروں کے واقعات سماجی اور اصلاحی ہیں ان کی حقیقت نگاری ڈپٹی نذیر احمد اور منشی پریم چند سے حد درجہ متاثر ہے۔ مصنفہ عصری حسیت کو کہانی کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کے افسانے ٹوٹ گئی، جذبہ معصوم، اچھوتی، وقت وقت، دل دل، اور تین چہرے تین آوازیں وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں سماج اور معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ گرچہ صالحہ کی کہانیاں رنگ آمیز ہونے کے باوجود حقیقت و مقصدیت پر مبنی ہوتی ہے جس میں سماج و معاشرے کی بدگمانیوں، محرومیوں اور کمزوریوں کی ترجمانی ملتی ہے۔

صالحہ عابد حسین کا شمار اردو ادب کی ایسی خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ صالحہ عابد حسین جس وقت افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئیں وہ پریم چند کا آخری زمانہ اور ترقی پسندی کا ابتدائی دور تھا۔ مغرب سے تانیثی ادب کی ہوا مشرقی ادب سے ہو کر گزر رہی تھی ذہن بڑی تیزی سے تغیر پذیر ہو رہا تھا۔

صالحہ عابد حسین نے اپنے افسانہ ''یہ نئی بستی'' میں جس کشمکش کو بیان کیا ہے وہ اپنے تہذیبی اور معاشرتی نظام کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ایک طرف غریب کی جھونپڑیوں میں پرورش پانے والے بچے اپنی آزادی و حقوق کے لیے کوشاں ہیں تو دوسری طرف ایسے تعلیم یافتہ باشعور اہل قلم اور اونچے عہدے والے جو اپنے ہی ہمراہ بسنے والے بچوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور طنز و ملامت کرنے کو باعث فخر سمجھتے ہیں انھیں ذرا بھی ندامت نہیں ہے کہ ان بچوں کی بے راہ روی میں صرف ان کے والدین ہی ذمہ دار نہیں بلکہ سماج کے ان باشعور اور باعزت افراد بھی اتنے ہی حصہ دار ہیں جنھوں نے کبھی بھی ان غریبوں کی طرف نظر عنایت نہیں کی۔ ذیل کا اقتباس کس قدر بلیغ ہے ملاحظہ کیجیے..........

''اس نئی بستی کے مکینوں کا عام نظریہ تھا۔ ان میں سے

اکثر گائے، بھینس اور مرغیاں بکریاں پالتے جو زیادہ تر کوٹھیوں کے باغوں اور لانوں کے دستر خوان سے پیٹ بھرتیں۔ نوکری پیشہ لوگ سویرے سائکل پر یا پیدل چھوٹے چھوٹے ناشتہ دان ہاتھ میں لٹکا کر چلے جاتے اور ان کی زندہ دل گھر والیاں گھروں کا تھوڑا بہت کام نمٹا کر باقی وقت آپس میں پیار بھری بات چیت میں صرف کر دیتیں جو اکثر ہاتھا پائی اور گالی گلوچ تک پہنچ جاتی اور مزے کی بات یہ ہے کہ چند گھنٹے بعد پھر وہ ایک کی ایک نظر آتیں۔''

(نئی بستی، درد و درماں، ص۔ 172)

صالحہ عابد حسین کے ایک افسانوی مجموعے ''نو نگے'' (1959) کا ایک مشہور افسانہ ''ایک عالم ہے اس رنگ میں'' میں معاشرے میں عورتوں کے تئیں لوگوں کا نظریہ، عورتوں کی زندگی کے ہر موڑ میں آنے والی دشواریاں، پرانی اور نئی قدروں کے درمیان کشمکش کی تصویر کشی کی گئی ہے کالج کی لڑکیوں کے لیے ماں کس قدر فکر مند رہتی ہے ملاحظہ کریں:

''نزہت کے ابا بڑی دیر بس اسٹاپ پر انتظار کر کے اور سمجھ کر لڑکیاں پہلے ہی گھر چلی گئی ہوں گی۔ اکیلے گھر پہنچے تو ان کی بیوی نے ان کو اس قدر آڑے ہاتھوں لیا کہ آئے حواس غائب ہو گئے۔ مینی کے گھر پوچھوایا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی نہیں آئی۔ خالد کو بلایا گیا اور ساری رات ابا اور خالد دلی کی سڑکیں ناپتے اور خاک چھانتے پھرے اور گھر پر اماں نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں پیٹ پیٹ کر منھ اور سینہ نیلا کر لیا۔ صبح نو بجے جا کر آخر یہ پتہ چلا کہ نزہت اسپتال میں زخمی پڑی ہے۔''

(نو نگے، (ایک عالم ہے اس رنگ میں)، از صالحہ عابد حسین، ص۔ 128)

صالحہ عابد حسین کے افسانے سماجی حقیقت نگاری کی عکاسی کرتے ہیں، جس میں زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو اصل روپ میں پیش کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوی مجموعہ 'درد و درماں' میں تمیں کہانیاں تحریر کی ہیں جو ہر زاویہ سے اپنے سماج و معاشرے کی انسانی شکست و ریخت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کہانی کی ہیروئن جب تنہا مصیبت میں پھنس جاتی ہے تب رکشہ والا ایک مسیحا بن کر اس کی مدد کے لیے آور دھوتا ہے جن کو اس کی منزل تک پہنچانے کے لیے پانچ گھنٹوں تک کڑی دھوپ میں خود کی پرواہ کیے بغیر گھومتا رہتا ہے۔ افسانہ 'رکشہ والا' کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں..............

''وہ دونوں بزرگ بھی ضرور اس کے محسن ہیں لیکن رکشہ والا! اس کا احسان بہت بڑا تھا، وہ غریب بے مایہ انسان جس کے گھر میں شاید اس رات چولہا نہ جلا ہو، اس نے ایک بے سہارا لڑکی کی مدد کی تھی۔ شاید اس رات اس کے بچے روتے روتے بھوکے سو گئے ہوں گے، شاید اسے اپنی بیوی کی گالیاں کھانی پڑی ہوں گی۔ کتنا مہان تھا وہ! صرف ایک انسان کا رشتہ تھا۔ اسے لادے لادے حیدرآباد کی سڑکیں ناپتا رہا۔''

(وہ رکشہ والا، مجموعہ درد و درماں، ص۔ 153)

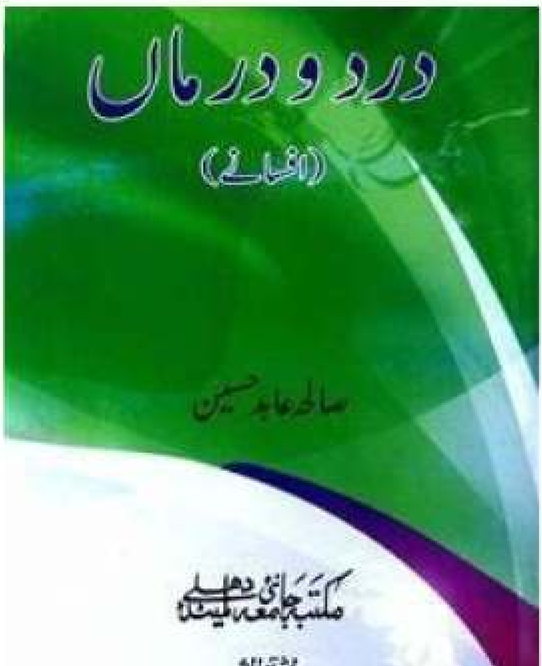

صالحہ عابد حسین اپنے افسانہ 'نئی بستی' میں جس طرح امیر و غریب کے فرق کو بیان کرتی ہیں اسی طرح افسانہ رکشہ والا میں ایک غریب کی محبت شفقت، انسان ہمدردی نے اسے اپنے سماج کا ہیرو بنا دیا ہے۔

صالحہ عابد حسین سرسید احمد خاں کی طرح مسلمانوں کی سماجی حالت سے حد درجہ بیزار تھیں اور اسے تبدیل کرنا چاہتی تھیں۔ بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرانا مسلمانوں کا اولین فریضہ قرار دیتی ہیں۔ کیونکہ کسی قوم کی ترقی و تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب اس قوم کا ہر فرد پڑھا لکھا ہو، ساتھ ہی ساتھ صالحہ عابد حسین تعلیم نسواں پر بھی زور دیتی ہیں۔

صالحہ عابد حسین اپنے افسانوں میں ایک پیغامبر کا روپ دھارے نظر آتی ہے، یہ ان کی باریک بینی اور اعلیٰ ذہانت کی دلیل ہے۔ جہاں وہ

معاشرے و سماج میں برائی و بدگمانی کو عیاں کرتی ہیں وہی مسائل سے حل کے لیے ان کے دل و دماغ میں طوفان بھی بپا ہے۔ افسانہ 'ہمدرد' میں لکھتی ہیں...............

''حالت تو یہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی تو اس جیسے ہیں دیس میں کہ ایک کمانے والا اور آٹھ دس کھانے، پینے، تعلیم پانے والے۔ جن کا اپنا ہی پورا نہیں ہوتا تو دوسروں کے کیا کام آئیں گے؟ جب تک دیس کی معاشی حالت نہ سدھرے گی، جب تک سب بیکاروں کو کام نہ ملے گا، جب تک بچوں کو تعلیم، بیماروں کو دوا علاج محتاجوں، ضرورت مندوں کو ان کی حاجتیں مفت نہ ملیں گی، اس دیس سے غربت، جہالت، بیماری، مصیبت کیسے دور ہو سکتی ہے، بھلا؟'' (ہمدرد، نو تنگے، صالحہ عابد حسین، ص۔137)

صالحہ عابد حسین کی انسان دوستی اور دردمندی کا جذبہ انسانیت کا علم بردار ہے وہ خود کو ذاتی حصار میں قید نہیں کرتی، کسی بھی مذہب، رنگ و نسل میں تفریق کو پسند نہیں کرتی باوجود اس کے انھیں عصری سماج و معاشرے میں ہر طرف تفریق نظر آتی ہے۔ ظاہری طور پر ہندوستان آزاد ہوا لیکن اس کی باطنی خاصیت آج بھی کھوکھلی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے 'نو تنگے' کا افسانہ 'بلا' کا کردار گوبندر جو آزاد ہندوستان کا فرد ہوتے ہوئے بھی آزاد نہیں ہے۔ گوبندر کو صالحہ نے زبان عطا کر دی ہے۔ گوبندر اپنے عہد کا جیتا جاگتا کردار ہے۔ اسے دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے کتنی محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے۔ گوبندر نے معاشرے کی بدگمانی، بے راہ روی، کو اس طرح پیش کیا ہے کہ حقیقت آنکھوں کے سامنے رقص کرتی نظر آتی ہے۔ مشرقی تہذیب میں پرورش پانے والی عورتیں جو مغربی ذہنوں کی غلامی کرنے پر باعثِ فخر سمجھتی ہیں، ان پر طنز کیا گیا ہے۔

صالحہ عابد حسین اپنے افسانوں کے ذریعہ سماج و معاشرے میں رائج غیر ضروری رسم و رواج کو رد کر کے ایک نئے معاشرے کی تلقین کرتی ہیں۔ ہر لمحہ ان کے فکر و عمل میں توازن پایا جاتا ہے۔ وہ پرانی اور نئی روایتوں کے بیچ کی مقلد ہے نہ ہی انھوں نے پرانے طریقہ حیات کو پوری طرح مسترد کیا ہے اور وہ نہ ہی نئے اصولوں کی پروردہ ہیں۔ 'نقش اول' کا تعارف بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کس طرح کرایا ہے، ملاحظہ فرمائیں......

''ان قصوں کا تعلق زیادہ تر ہماری تہذیب و معاشرت اور گھریلو زندگی سے ہے جن میں افسانوں کے لیے کافی سامان موجود ہے۔ نظر اور تخیل شرط ہے اور اس کے ساتھ بات کرنے کا طریقہ بیگم صالحہ عابد حسین میں یہ تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ان قصوں کے زبان و بیان سادہ اور دلکش ہیں ان میں بعض پر لطف بھی ہے اور بعض پر درد۔''

(صالحہ عابد حسین نمبر، ماہنامہ کتاب نما، ص۔96)

افسانہ ''بیکار سامان'' میں نوجوان نسل کی بے راہ روی، بد اخلاقی، بددیانتی، کو زیر قلم لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج کی نوجوان نسل نے اپنے آپ کو۔ ہر انسان اپنے اسٹیٹس (Standard of Living) کی فکر میں اپنے بزرگوں کی اہمیت کو بھول بیٹھا ہے۔

صالحہ عابد حسین نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی ذہنیت کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ زمانہ کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے، مرد کی حاکمیت کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ اس کی ایک جھلک صالحہ عابد حسین کے افسانوی مجموعے 'نو تنگے' کا افسانہ 'ماں' کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں..................

''اور آخر وہ نذیر سے بیاہ دی گئی۔ مریض و مدقوق شوہر نے اس کی پوری قدر کی۔ اس کے پاس دولت نہ تھی کہ وہ رفیہ کو عیش کرا سکتا۔ البتہ محبت کی فراوانی تھی جس کی وہ اس پر مسلسل بارش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ رفیہ کی نس نس کا خوں، دل کی گرمی، آنکھوں کی چمک، سب اس کی وحشیانہ محبت کی بھینٹ چڑھ گئی اور سال بھر کے اندر اندر وہ جانے کتنے نسوانی امراض میں مبتلا ہو کر چھ مہینے تک زنانہ اسپتال میں پڑی ایڑیاں رگڑتی رہی۔'' (ماں، نو تنگے، صالحہ عابد حسین، ص۔ ۴۷)

صالحہ عابد حسین کے افسانوں کا پلاٹ مضبوط اور گٹھا ہوا ہوتا ہے ان میں واقعات کا تسلسل ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں عام انسانوں کے دکھ درد، خوشیوں، کامیابیوں اور ناکامیوں کو بڑے سلیس اور رواں دواں انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ان سارے واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے بلکہ اس سمت اور موضوع کی طرف دوسروں کی توجہ مرکوز کرانے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔ یعنی یہ کہ موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں سطح پر صالحہ عابد حسین ایک کامیاب فکشن نگار ہیں۔

□□□

Sufiya Mahmood
Research Scholar
Visva-Bharati University
Santiniketan-731235 (West Bengal)

ڈاکٹر حنا شمائم

پہلا بچہ

صبح کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ ڈاکٹر فاطمہ ناشتہ کرنے میں مصروف تھی۔ کلینک سے بار بار فون آ رہا تھا کہ میڈم جلدی آ جائیں آج مریض کی بھیڑ زیادہ ہے۔ ویسے تو ڈاکٹر فاطمہ کا مریض دیکھنے کا وقت نو بجے صبح سے تھا لیکن وہ دو دنوں کے لیے باہر گئی تھیں جس کی وجہ سے آج کلینک میں زیادہ بھیڑ ہو گئی تھی۔ ناشتہ ختم کر کے وہ جلدی سے تیار ہوئیں اور گاڑی ڈرائیو کر کے آٹھ بجے تک کلینک پہنچ گئیں۔ نرس نے صحیح کہا تھا آج زیادہ ہی بھیڑ تھی۔ مریض دیکھتے دیکھتے گیارہ بج گئے تھے۔ ڈاکٹر فاطمہ نے چائے پی اور پھر سے مریضوں کو دیکھنے میں مشغول ہو گئیں۔

اگلی مریضہ جو چیمبر میں داخل ہوئی وہ دیکھنے میں ہی بہت کمزور لگ رہی تھی۔ بدن پر سوجن چہرے پر پیلا پن اور ساتھ ساتھ ہانپ بھی رہی تھی۔ اس کے ساتھ دو عورتیں تھیں۔ ڈاکٹر نے اس کی تکلیف پوچھی اور چیک اپ کیا۔ اس کو سات ماہ کا حمل تھا۔ ڈاکٹر فاطمہ نے پوچھا پہلے کہیں علاج کرایا ہے یا نہیں۔ اس کی ماں بولی ای اب تک سسرال میں تھی۔ کل زبردستی ہم لے کر آئے۔

اس کی ساس بڑی ظالم ہے۔ کہیں دکھانا نہ چاہے ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس کو خون کی بہت کمی ہے۔ کھلانا پلانا تو چاہیے تھا۔ مریضہ کی ماں بولی کہ اس کی ساس کہے ہے کہ غذا کھائے سے بچہ پشت ہو جائے گا پھر آپریشن کراوے پڑے گا۔ ڈاکٹر نے پوچھا کہ جب وہ لوگ خیال نہیں رکھتے تو وہاں کیوں چھوڑا پہلے ہی لے آنا تھا۔ مریضہ کی بہن نے جواب دیا کہ او سب آوے ہی نہ دے رہی تھی کی کام کون کرے گا۔ ایسا جان میں بھی سب کام یہی کرتی تھی۔ اس کا مردانہ اتنا کمینہ ہے۔ روز تاڑی پی کے آوے گا اور اس کو مارے گا۔ ٹمپو چلاوے ہے مگر ایک پیسہ اس کے ہاتھ میں نہیں دھرے ہے۔

ڈاکٹر نے مریضہ چیک اپ کیا۔ کچھ دوائیں اور ضروری جانچ وغیرہ لکھ دیا۔ ای سب جانچ کرانا ضروری ہے؟ مریضہ کی ماں نے پوچھا ہاں ضروری ہے ڈاکٹر نے جواب دیا۔ دوسرے دن مریضہ کی بہن رپورٹ لے کر آئی۔ ہیموگلوبین 8 گرام تھا۔ خون بہت کم ہے ڈاکٹر نے مریضہ کی بہن سے کہا۔ کتنا بلیڈ ہے اس نے پوچھا۔ بس آٹھ گرام ہے۔ اور کتنا ہونا چاہیے۔ 12 سے 15.1 گرام ڈاکٹر نے بتایا۔ میں خون بڑھنے کا انجکشن دے رہی ہوں اس سے خون جلدی بڑھے گا۔ کل آ کر دلا لیں گے مریضہ کی ماں بولی۔ ہر دس دنوں پر چیک اپ کراتی رہنا۔ لیکن دوسرے دن وہ نہیں آئی۔ ایک مہینہ بعد چیک اپ کے لیے آئی ڈاکٹر نے پوچھا اتنی دیر سے کیوں آئی مریضہ نے کہا کہ سب لوگ بولے کی مہینہ مہینہ دکھانا چاہے اتنا جلدی جلدی تھوڑے ہی دکھایا جا ہے۔ ڈاکر نے سمجھایا کہ وقت نزدیک آنے پر کم وقفے پر ہی دکھانا چاہیے خاص کر ان لوگوں کو جن کو زیادہ دقت ہے اور ویسے بھی بلڈ پریشر چیک کراتے رہنا ضروری ہے۔ چیک اپ کرتے ڈاکٹر کو بچے کی پوزیشن صحیح نہیں لگ رہی تھی۔ اس لیے ڈاکٹر نے الٹرا ساؤنڈ کرانے کو کہا۔ اس کے رشتے داروں نے کہا کہ اب ای ٹائم میں پھوٹو کرائے سے بچے کے دماغ پر اثر پڑ جا گا۔ خیر بہت سمجھانے کے بعد وہ لوگ الٹرا ساؤنڈ کرانے کو تیار ہوئے۔ جب الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ آئی تو

بچہ آڑا تھا۔ ڈاکٹر نے مریضہ اور اس کے رشتے داروں کو سمجھایا کہ اس کا وقت کے پہلے آپریشن کرنا پڑے گا نہیں تو پریشانی ہوگی بچہ آڑا ہے نارمل نہیں ہوگا۔ زیادہ درد ہونے پر بچہ دانی پھٹ بھی سکتی ہے۔ بہت غریب آدمی ہیں میڈم کوئی دوا دے دیتیں بچہ سیدھا ہو جا گا۔ دوا سے بچہ کو سیدھا نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر نے سمجھایا۔ اس کے بعد مریضہ اور اس کے رشتہ دار یہ کہہ کر چلے گئے کہ مشورہ کرکے آئیں گے لیکن پھر وہ لوگ نہیں آئے۔

لگ بھگ بیس دنوں بعد وہ مریضہ درد میں تڑپتی ہوئی پریشان حال اپنے رشتہ داروں کے ساتھ پہنچی۔ بچا لیجیے میڈم اس کی ماں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ دیکھیے میں نے محلے کے لوگوں کے کہنے پر ایک میڈم کے یہاں لے گئے۔ او دیکھ کرے بولی کی ہم نارمل ڈیلیوری کرا دیں گے۔ پھر ہم لوگ اس کے یہاں دکھانے لگیں۔ آج درد ہوا تو لے کے گئے سوئی دوا کی اور بولی جلدی کوئی بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ آپریشن ہوگا۔ بس ہم لوگ آ گئے جلدی ہاتھ لگائے میڈم وہ رونے لگی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ بس ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا ہے او بولی ہے ہم لوگ آ گئے۔ آڑے بچے میں نارمل ڈیلیوری کرانے کی کوشش میں اکثر ایسا ہوتا ہے ڈاکٹر نے سمجھایا۔ بچے کی دھڑکن نہیں مل رہی تھی۔ جتنا جلدی ہو سکے آپریشن کر کے بچے کو نکالنا ہوگا۔ ہیموگلوبین ساڑھے آٹھ گرام تھا ڈاکٹر نے دو یونٹ خون کا انتظام کرنے کو کہا۔ بجار والا خون لے آویں۔ مریضہ کی ماں نے پوچھا۔ ڈاکٹر کا جواب تھا بالکل نہیں، گھر کے آدمی کا خون دیجیے۔ اگر گروپ نہیں ملتا ہے تو بلڈ بینک سے اپنا خون دے کر لے لیجیے۔ میرے یہاں کسی کو اتنا سکتی نہ ہے کہ بلیڈ دے سکے۔ اس کی ماں بولی۔ ڈاکٹر نے سمجھایا کہ اتنا سا خون دینے سے کوئی مشکل نہیں ہوتی ہے۔ جلد ہی نیا خون بن جاتا ہے۔ بلکہ ہر کچھ دنوں پر اپنا خون ڈونیٹ کرتے رہنا چاہیے۔ بازار کے خون میں ہیموگلوبین کم رہتا ہے اور گھر کے خون میں ہیموگلوبین اچھا رہتا ہے۔ سسٹر نے خبر کی کہ انیستھیٹسٹ یعنی بیہوش کرنے کے لیے ڈاکٹر آ گئے ہیں۔ مریضہ کو آپریشن تھیٹر میں شفٹ کیا جا چکا ہے۔ پیڈیاٹریشین یعنی بچے کے ڈاکٹر کو کال کرنے کی ہدایت دے کر ڈاکٹر فاطمہ او۔ ٹی کی طرف بھاگیں۔

ڈاکٹر نے آپریشن کر جلد از جلد بچے کو نکالا۔ بچے کا رنگ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے نیلا ہو گیا تھا۔ بچہ رو بھی نہیں رہا تھا۔ لیکن سانسیں چل رہی تھیں۔ بچے کے ڈاکٹر نے کافی محنت کی تب بچہ رویا۔ انھوں نے کہا کہ بچے کے سانس لینے کا ڈھنگ صحیح نہیں ہے۔ اس کے پھیپھڑے میں گندا پانی چلا گیا ہے۔ اس کو ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔ بچے کی حالت کو دیکھتے ہوئے ان لوگوں نے حامی بھر دی۔ اس کو ایک ہفتہ تک ایڈمٹ رکھنا پڑا۔ ایسے تو ڈاکٹر فاطمہ آپریشن کی مریضوں کو چار دنوں میں ہی ڈسچارج کر دیتی تھیں لیکن یہ مریضہ زیادہ کمزور تھی اس لیے اسے ایک ہفتے بعد چھٹی ملی۔ دس دنوں بعد وہ مریضہ فالو اپ کے لیے آئی تو پہلے سے کافی بہتر تھی لیکن ابھی بھی کمزور تھی۔ تقریباً ایک ماں بعد وہ مریضہ پھر فالو اپ کے لیے آئی۔ مانگ میں سندور، سرخ ساڑی میں ملبوس دونوں ہاتھوں میں بھری ہوئی چوڑیاں۔ ڈاکٹر فاطمہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی تو اس نے بتایا کہ کل سوا مہینہ پورا ہوا ہے اس موقع پر تقریب تھی۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس کی وجہ اس نے یہ بتایا کہ یہ زچہ بچہ کی حفاظت کے لیے ہے۔ مریضہ کی ماں نے بتایا کہ اس کا شوہر آنے والا ہے سوا مہینہ بعد لے جانے کو مانگ رہا ہے۔ اب تو جو ہوگا سسرال میں ہی ہوگا۔ پہلا بچے مائیکے میں ہوتا ہے اس لیے ہم لے آئے تھے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد ڈاکٹر فاطمہ سوچنے لگی ہاتھ میں لوہے کا ٹکڑا، دونوں ہاتھوں میں بھری ہوئی چوڑیاں، مانگ میں سندور، سرخ ساڑی میں ملبوس وہ کہہ رہی تھی پہلا بچہ تو مائیکے میں ہوتا ہے۔ یہ وہم کہ کھجور کھانے سے نارمل ڈیلیوری نہیں ہوگی جبکہ قرآن شریف میں اس بات کا ذکر ہے کہ حضرت مریم کو حمل کے دوران کھجور کھانے کو کہا گیا تھا۔ ان فضول رسموں پر دھیان دینے کی بجائے حمل رہنے پر اگر مریضہ کا صحیح طور سے علاج ہوتا، غذا کا دھیان رکھا جاتا تو خون کی اتنی کمی نہیں ہوتی۔ شاید ڈیلیوری کے دوران اتنی مشکلوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا خرچ بھی کم ہوتا۔ بچہ کو اتنے دنوں تک ایڈمٹ بھی نہیں رکھنا پڑتا۔ آخر یہ سب چیزیں وجود میں کیسے آئیں۔ یہ فضول رسم و رواج ذہن میں اس طرح سے گھر کر چکے ہیں کہ ضروری باتیں پیچھے رہ گئی ہیں لوگ انھیں رسموں کو زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں اور ان باتوں کو ذہن سے نکالنا بہت مشکل ہے۔ وہ اس مسئلہ کا حل نکالنے کے لیے ہر ماہ ایک ہیلتھ کیمپ کا انعقاد کرنے کا سوچنے لگیں جس میں عورتوں کو حمل میں لینے والے احتیاط اور علاج کے متعلق جانکاری بھی دی جائے۔ ہاں یہ بہت اچھا طریقہ رہے گا۔ دل و دماغ نے بھی حامی بھر دی اور ڈاکٹر فاطمہ اسے عملی جامہ پہنانے کی تیاری میں لگ گئیں۔

□□□

Dr. Hena Shamayem
Alam Clinic
Kaghzi Mohalla
Bihar Sharif
Nalanda-803101 (Bihar)

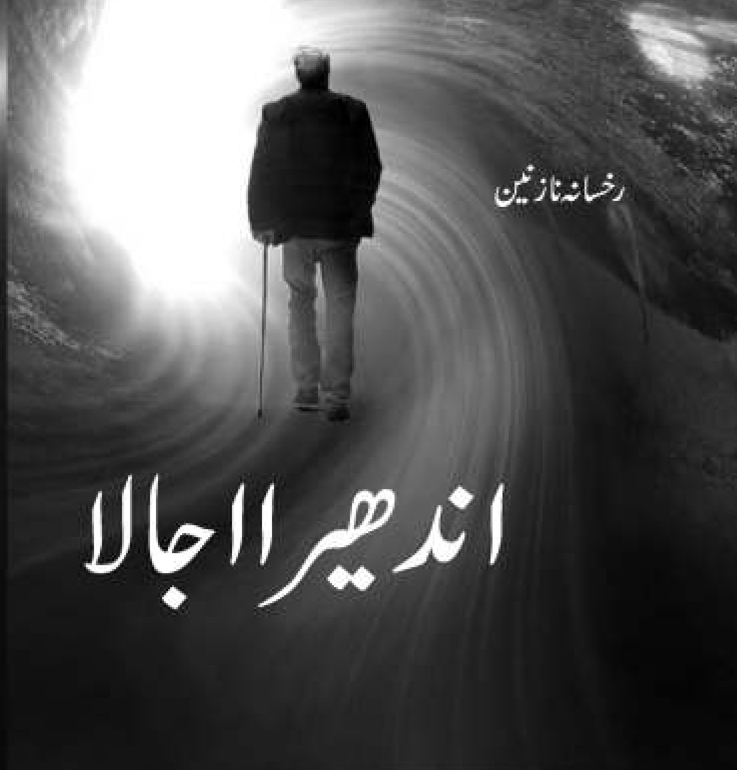

اندھیرا اجالا

رخسانہ نازنین

''میری پیاری بھابھی! آپ کو جب بھی دیکھوں جی باغ باغ ہوجاتا ہے۔آج بھی آپ اتنی ہی خوبصورت اتنی ہی خوش مزاج ہیں!وہی رنگ ڈھنگ وہی چال ڈھال کیسے مینٹین کرتی ہیں یہ سب؟''

نکہت اپنے میکے میں آئی تھی اور شگفتہ کو دیکھ کر لپک گئی...

''ہٹو بے وفا کہیں کی!ایک شہر میں ہونے کے باوجود تمھیں اتنے دنوں بعد ہماری یاد آئی؟...!'' شگفتہ اپنی تعریف پر مسکرادی اور ساتھ ہی اپنائیت بھرا شکوہ بھی کیا!

شگفتہ کے جواب میں نکہت اپنی مقبولیت، تقریبات، اور گھر کی مصروفیات کا رونا روتی رہی شگفتہ تب تک اپنی پیاری نند کی تواضع میں لگ گئی تھی...نکہت کو اس گھر سے وداع کیے ہوئے برسوں بیت گئے مگر اب بھی اس کا آنا سب کے لیے بڑی خوشی کا باعث ہوتا تھا وہ جتنی دیر یہاں رہتی سب کے ساتھ مل کر خوب خوشیاں سمیٹتی خصوصاً اپنی بھابھی کے ساتھ خوب ہنستی چہکتی رہتی تھی۔ شگفتہ نے اس کی آمد پر کچن کا رخ کیا تو بھابھی کے پیچھے پیچھے نکہت بھی کچن میں آئی اور مزید شوخی کرنے لگی۔

''بھابھی!شادی کے اتنے سالوں بعد بھی آپ، آپ ہی ہیں!اس گھر پر حکمرانی اور بھیا کے دل پر قبضہ آج تک قائم ہے۔مگر اس رانی سے مجھے ایک شکوہ ہے!وہ یہ کہ اس کے پاس سلطنت تو ہے مگر سلطنت میں خزانہ نہیں ہے!آپ اتنی پڑھی لکھی تھیں اپنی پوسٹ گریجویشن کی تعلیم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیسے بھی کمالیتیں تو کتنا اچھا ہوتا!''

''رانی کے پاس سلطنت ہے یہی کافی ہے اور جب سلطنت جنت جیسی ہو تو خزانے کی فکر کسے ہوگی؟اخلاص، محبت، رفاقت، نعمت، سکون اور شکر یہی تو جنت کی دولت ہے! الحمد للہ...نعمان شادی سے قبل ہی برسر روزگار ہوگئے تھے۔ پرکشش مشاہرہ پاتے تھے جو ہمارے گزارے کے مطابق تھا اسی لیے میں نے کبھی پوسٹ گریجویشن کی تعلیم سے جاب کا ٹینشن نہیں لیا ویسے بھی مجھے جاب کرنے کی نہ ضرورت تھی نہ موقع، کیونکہ عورت کی خوشحال زندگی اس کے گھر، شوہر، اور بچوں ہی سے ہوتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم اس کے کردار کو سنوارتی ہے اور بچوں کی بہترین تربیت میں معاون ہوتی ہے۔ محض جاب کے لیے عورت کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا، میں اس نظریے کی مخالف ہوں اور ضرورت نہ ہونے کے باوجود شوقیہ ملازمت کرکے خواتین ضرورت مند خواتین کی حق تلفی کرتی ہیں۔'' شگفتہ کی تقریر کی زد میں نکہت خود بھی تھی کہ وہ عورت کو محدود ہونے پر مقید سمجھتی تھی!اور یہ تفصیل اس کے لیے گویا مدلل جواب تھا مگر ماحول خوش گوار ہی رہا اور ہنستے کھیلتے کچن میں کھانے کی تیاری پوری ہوگئی...بعد طعام نکہت

نے شاہد کے دفتر سے لوٹنے کے سبب واپسی چاہی...

"گھر میں ملازمین ہیں بچے بھی بڑے ہوگئے ہیں تو اب کون سی مصروفیات ہیں؟"....

شگفتہ نے روکنا چاہا

تو نکہت کی امی نے بھی بہو کی بات کو ہاتھوں ہاتھ لیا

"شام تک ٹھہر جاؤ نعمان دفتر سے آتے ہوئے شاہد میاں کو بھی یہیں لے آئیں گے"۔

مگر اس نے ایک نہ سنی اور جیسی آئی تھی ویسے ہی چلی گئی!

نعمان خان اور شاہد مرزا ایک ہی کالج میں پڑھے اور ایک دفتر میں کام کرتے تھے اور دونوں میں بوس اور ملازم ہی نہیں سالے بہنوئی کا کھٹا میٹھا رشتہ بھی تھا! دونوں اپنے کام میں ایماندار، بااصول اور لگن کے پکے تھے مگر اس ترقی یافتہ دور کی مصروفیات نے انھیں رشتہ دار سے زیادہ کولیگ بنا کر رکھ دیا تھا! نعمان اپنی نرم مزاجی سے کسی بھی حال میں مطمئن رہا کرتا تھا اور شاہد ذرا تنگ مزاج اور شدت پسند آدمی واقع ہوا تھا....

نعمان نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ 5 بجنے والے تھے۔ وہ فائلیں سمیٹ کر بیگ میں رکھ رہا تھا۔ شاہد نے اسے دیکھ کر چٹکی لی "ارے یار برسوں بیتے مگر تم جیسے تھے ویسے ہی رہے... آج بھی تمھاری وقت پر گھر لوٹنے کی تیاری دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ آفس ٹائم ختم ہوا کہ گھر جانے کے لیے تیار....! کبھی ہمارے ساتھ بھی کچھ دیر گپ شپ کر لیا کرو۔ کم از کم بطور بوس تو میرا کوئی حکم مانا کرو"۔

"نہیں یار... تم بوس آفس ٹائم میں ہو اور اب آفس ٹائم ختم ہو چکا! رہی بات گپ شپ کی وہ دن بھر کام کے ساتھ چلتی ہی رہتی ہے۔ آفس کے بعد میرا پورا وقت گھر والوں کے لیے ہوتا ہے۔ امی، بابا، بچے ان سے بات چیت، ان کی دلجوئی، اہلیہ کے ساتھ گھریلو معاملات پر گفتگو۔ بچوں کی تعلیم وتربیت پر توجہ.... گھر کے کام کاج میں بھی ہاتھ بٹاتا ہوں۔ سودا سلف لاتا ہوں۔ یہی میری ذمے داریاں ہیں۔" اس نے متانت سے جواب دیا اور گھر کی راہ لی.... شاہد اسے دیکھتا رہ گیا۔

نعمان گھر پہنچا تو شگفتہ نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ ہلکا سا میک اپ کیے، بال سنوارے۔ صاف ستھرے لباس میں ملبوس.... نعمان کی ساری تھکن اس کی مسکراہٹ نے دور کر دی اس نے ہال میں بیٹھے بابا اور امی کو سلام کیا اور ان کے قریب بیٹھ گیا۔ مزاج پوچھا دن بھر کی مصروفیات جانیں، دونوں نے دعائیں دیں ریحان اور سمیہ بھی کالج سے آ گئے تھے اس نے ان دونوں کی بھی سرگرمیوں کے متعلق پوچھا پھر سب نے ساتھ میں چائے پی۔

شگفتہ رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ گھر کے تمام افراد صوم وصلوۃ کے بھی پابند تھے۔ ایک خوشگوار ماحول جس میں سبھی رشتے خلوص، محبت اور عقیدت کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا احترام کرتے تھے۔

وہیں اس وقت ایک مہنگے ریستوران میں شاہد اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ میں مصروف تھا چائے اور سگریٹ کا دور چل رہا تھا۔ حالات حاضرہ کے علاوہ بیشتر موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ موبائل کی رنگ ہوئی اسکرین پر چمکتا نام دیکھ کر اس کے چہرے پہ بے زاری کے آثار نمایاں ہوئے اس نے کال ریسیو کی" میں نے دفتر فون کیا تھا آپ کو وہاں سے نکلے کافی دیر ہو گئی۔ ! کہاں ہیں؟ گھر کب آئیں گے کھانے کے لیے انتظار ہو رہا ہے۔!" نکہت کی بات سن کر وہ بھڑک اٹھا "تم میری جاسوسی کرنے سے باز نہیں آؤ گی! اور کئی بار کہہ چکا ہوں کہ کھانے پر میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں میں دوستوں کے ساتھ ہوں کھانا بھی انہی کے ساتھ ہوگا!" اس نے سخت لہجے میں کہا اور کال کاٹ دی۔ "عجیب عورت ہے! پیچھے ہی پڑی رہتی ہے! یہ عورتوں کی بڑی بری عادت ہوتی ہے کہ شوہروں کو ہمیشہ اپنے پلو سے باندھے رکھنا چاہتی ہیں۔ ہم مرد ہیں، ہماری اپنی مصروفیات ہیں! ہر بات ان کو بتانی ضروری نہیں ہوتی۔!" اس کے لہجے میں اپنی بیوی کے لیے عجیب سی حقارت تھی۔ سارے دوست جن کے تفریحی شوق اور خرچے شاہد کے ذمے تھے ہر بات پر تائید کرتے جاتے تھے۔

شاہد کے فون کاٹنے پر نکہت آگ بگولا ہو گئی۔ "یہ شخص آخر خود کو سمجھتا کیا ہے؟ بیوی ہوں کوئی ملازمہ نہیں جو اس کا گھر سنبھالوں۔ اس کے ماں باپ کی خدمت کروں، اس کے بچے پالوں اور یہ اپنا وقت دوسروں پر لٹائے۔ میرے بھی جذبات اور احساسات ہیں جس کی اسے کوئی پرواہ نہیں۔ بیوی صرف ضرورت کے لیے یاد آتی ہے اسے!" وہ غصے سے بڑبڑاتی رہی۔ بچے آئے دن کی اس صورتحال سے اکتا کر اپنے مشغلوں میں مگن رہتے تھے اور ساس، سسر بھی بیٹے بہو کے اختلافات سے دکھی تھے مگر کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ شاہد اور نکہت میں کبھی ذہنی اور دلی ہم آہنگی نہ ہو پائی۔ شاہد سے ملی بے رخی کا سارا غصہ نکہت بچوں اور ساس، سسر پر نکالا کرتی جس سے گھر کی فضا مکدر رہا کرتی۔ شاہد پشتینی امیر کبیر گھرانے

سے تعلق رکھتا تھا۔ عالیشان بنگلہ کار یں عیش سے پر زندگی. حسین وجمیل بیوی دو پیارے پیارے بچے نوید اور ثمین، امی، ابو.....! مگر روزمرہ کی تلخیوں نے زندگی کی سچی مسرتیں چھین لی تھیں۔ نکہت اپنا سارا وقت شاپنگ اور ٹی پارٹیوں میں گزارا کرتی۔ ضعیف ساس، سسر گھر میں اس کی راہ تکتے کہ ''کب بہو آئے اور گھر سنبھالے!'' گھر میں ملازمین کے ہونے سے نکہت امورخانہ داری کے معاملے میں بالکل بے فکر تھی اور اہل خانہ کے معاملے میں بے پروا!. بچوں کی پرورش میں بھی آسائشوں کا راستہ اختیار کرتے ہوئے شاہد اور نکہت اپنی اپنی زندگی میں مگن رہے اور بچوں کی تربیت کی طرف قطعی دھیان نہ دیا! بس دولت ہی کو ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کے مترادف جان کر بچوں کے اطراف ٹریز ٹیوٹر اور نوکروں کی سہولت فراہم کردینا ان کے نزدیک کافی تھا!

آج بھی شاہد دیر رات لوٹا تو دونوں میاں بیوی میں خوب تکرار رہی۔ علی الصبح مناظرہ چل ہی رہا تھا کہ ثمین نائٹ ڈریس میں بے حال آئی اور چلانے لگی ''مما! پپا!! بھیا کو دیکھیے اسے کچھ ہوگیا ہے...!''

نوید اپنے کمرے میں بے ہوش پڑا دکھائی دے رہا تھا

''نوید نوید اٹھو کیا ہوا.....بیٹے! کچھ کہو.....''

جب حالت سمجھ میں نہیں آئی اور کچھ کرتے نہیں بنا تو وہ اسے ایسے ہی اٹھا کر دواخانے لے گئے...راستے میں ثمین نے بتایا کہ ''چار بجے تک بھیا فیس بک پر لائیو تھا....اور کچھ بکواس کیے جا رہا تھا۔ میرے دوستوں نے مجھ سے شکایت کی تو میں اسے روکنے گئی دیکھا کہ وہ اپنے کمرے میں بیہوش پڑا ہے''

''شاہد صاحب آپ کا بیٹا ڈرگس لینے لگا ہے.! اور اب اس کی طلب شدت کو پہنچ چکی ہے۔ اب اس کا علاج ممکن نہیں!'' ڈاکٹر کی بات سن کر شاہد کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ نوید کب اس زہر کا عادی ہوا انھیں پتہ ہی نہ چلا۔ وہ پڑھائی پہ توجہ نہیں دے رہا تھا۔ گریجویشن بھی نہیں کر پایا انھیں اسی بات کا دکھ تھا کہ کانوینٹ کی تعلیم اور ٹیوشن بھی کارگر نہ ہو سکے.! نکہت بھی اس انکشاف پر بھونچکا سی رہ گئی۔ وہ دونوں اپنی ازدواجی زندگی کی تلخیوں میں اپنے بچوں کی تربیت سے غافل ہوتے گئے اور بچے بے راہ روی کا شکار ہوگئے۔ پچھلے دنوں ان کی بیٹی ثمین نے خودکشی کی کوشش کی تھی کہ اسے ایک غیر مذہبی لڑکے سے محبت ہوگئی تھی۔ شاہد اور نکہت کو پتہ چلا انھوں نے ثمین کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور اس لڑکے سے تعلقات ترک کرنے کو کہا تو اس نے دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں کھالیں۔ بمشکل ڈاکٹر نے اس کی جان بچائی تھی اور اب بیٹا اس لت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ گھر کے ناخوشگوار ماحول اور مسموم فضا میں دو کھلتے گلاب مرجھا گئے۔ شاہد اور نکہت بچوں کی تباہی اور بربادی پر ایک دوسرے کو ذمے دار ٹھہراتے ہوئے پھر سے الجھ رہے تھے۔

نعمان اور شگفتہ سائبان میں بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ دونوں کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے اور اس کی وجہ اخبار خوانی تھی کہ آج ان کے بیٹے ڈاکٹر حافظ ریحان خان کو ایک طبی تحقیق پر صوبائی حکومت کی طرف سے ایوارڈ سے نوازے جانے کی خبر چھپی تھی! جس میں اس کی اس کامیابی کا کریڈیٹ اس کے والدین کو دیا گیا تھا جن کی صالح تربیت کے نتیجے میں وہ قوم وملت کی خدمت کے ساتھ اپنے وطن کا بھی نام روشن کر رہا تھا.....

ابو، امی ابھی ابھی جامعہ روضۃ البنات سے فون آیا تھا. مجھے وہاں درس وتدریس کی خدمات انجام دینے کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے! سمیہ نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا.....

نعمان نے بیٹی کو مبارک باد دی اور شگفتہ کی زبان پر شکر جاری ہوگیا کہ ''اے اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے ہمارے بچوں کو ہمارے لیے باعث فخر بنایا...'' خوشی کے اس ماحول میں شکرگزاری کی یہ کیفیت ایسی تھی جیسے انوار کی بارش میں بندے سربہ سجود ہو جائیں!

□□□

Rukhsana Naazneen
H. No. 4-2-22
Noor Khan Taleem
Bedar-585401 (Karnataka)

کہانی

زائرا حسینی

امی

آسمان بالکل صاف تھا۔شام رات سے گلے ملنے کے لیے بیتاب تھی، بادلوں سے بے نیاز حد نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن ہو گئیں تھیں۔ ہوا ہلکی پھلکی تھی۔اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ ماضی کی یادیں خواہ وہ شریں ہوں یا تلخ، اس کا تسلسل حال اور ماضی کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔ آج نہ جانے کیوں اسے فریدہ کی یاد بے حد ستا رہی تھی۔ اس کا دل و دماغ پریشان تھا۔دل فریدہ کی یادوں میں کھو گیا۔فریدہ کے ساتھ گزرے ہوئے حسین دن ذہن کی سطح پر ابھرنے لگے۔گزرے ہوئے مناظر اس کی آنکھوں میں آتے جاتے رہے۔

فریدہ اس کی ایک بہترین سہیلی تھی جس کی شادی ڈیڑھ سال قبل دہلی میں ہوئی تھی۔اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ چلو اچھا گھرانا ملا۔لوگ نیک صفت ہیں۔ان لوگوں نے لکھنؤ جا کر خود اسے پسند کیا۔گوری رنگت پر ساس فریفتہ ہوئی۔انھوں نے نسوانی حسن کا ایسا نادر نمونہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔صاف ستھرے رنگ کی لڑکی، دیکھنے والا اپنی نظریں ذرا مشکل سے ہٹاتا تھا۔آنکھوں میں تاثر اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، پسند کیا، فوراً رشتہ طے ہوا اور وہ اپنے بیٹے زاہد کے ساتھ بیاہ کر گھر لائیں۔ان کا فلیٹ گنجان آبادی میں تھا، لوگوں کو خبر ہوئی تو دلہن دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ سادگی، معصومیت کا پیکر دلہن کے لباس میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ساس نے فخریہ انداز میں لوگوں سے ملایا۔عزیز و اقارب نے ان کی پسند کی داد دی۔دیکھنے والوں نے نہ صرف فریدہ کے حسن کی تعریف کی بلکہ اسے اپنی آنکھوں میں سجایا۔سسر نے بیٹی جیسا پیار دیا اور ساس نے کلیجہ سے سٹا کر پیشانی کا بوسہ دیا۔

جاڑوں کی یخ بستہ سرد ہوائیں جسم کے ہر حصہ کو منجمد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔لگتا تھا خوشیوں کو پنکھ لگ گئے۔گلاب کی مہک اور ہارسنگھار کے پھولوں کی نفیس خوشبو بہت خوشگوار احساس دلا رہی تھی ہر وقت ساس کو بیٹے کا مسکراتا چہرہ نظروں میں گھومتا رہتا اور وہ ان خوبصورت لمحات میں کھوئی رہتی۔فریدہ اپنے شوہر کی محبت کو دیکھ کر خوشحال زندگی کے سپنے سجانے لگی۔ابتدا میں اپنا رنگ جمانے کے لیے اس نے صبح اٹھ کر شوہر کے لیے چائے اور سسر کے لیے گرم گرم ناشتہ دینا شروع کیا تا کہ ان پر اپنا سکہ جما سکے۔اپنے فرائض کا رعب ڈال سکے اور ان لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لے۔اپنی زبان کے مٹھاس اور خود اعتمادی سے انھیں جیت سکے۔مگر جب اس نے اپنے سر کا گھونگھٹ سرکایا اور گھر کے آنگن میں قدم جمایا تو اس کی رنگت میں ایک فرق آ گیا۔آہستہ آہستہ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگتی پہلے تو گھر کے لوگوں نے اس تبدیلی پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا مگر جب اس پر کچھ گہرا رنگ چڑھنے لگا تو سسر کی تجربہ کار نگاہوں نے پہلے توجہ دی حالانکہ ساس پھر بھی اپنی محبت سے سرشار تھیں۔وہ ہمہ وقت شفقت اور محبت کا اظہار کرتیں۔اپنی دعائیں اس پر نچھاور کرتیں انھیں کوئی نقص نظر نہیں آ رہا تھا کہ گھر کے نظام میں یوں تبدیلی بھی آ سکتی ہے۔شروع میں سسر نے فریدہ پر اپنی محبت کا رنگ ڈالا لیکن

جب اس کے رویہ میں انھیں آہستہ آہستہ تبدیلی نمایاں ہونے لگی تو پھر انھوں نے اپنی محبت کی چادر کو سمیٹ لیا۔ ان کے دل میں ایک کرب سا اٹھا جوان کی آنکھوں سے نظر آرہا تھا۔ اکلوتی بہو کا یہ رویہ، اب وہ جب بھی گھر آتے خاموشیوں میں ڈوبے بجھے بجھے نظر آتے۔ ان کے اندر قابل اعتماد اور پر وقار جذبہ ختم ہوگیا۔

ہر صبح وہی تھی اور ہر شام وہی لیکن اب روزمرہ کی زندگی کے رنگ میں بھنگ ہونے لگا۔ پہلے فجر کی نماز پر فریدہ اٹھتی تو سسر کا دل باغ باغ ہوتا اور ساس اپنی نماز میں شکرانہ ادا کرتی کہ معبود کو بھلایا نہیں بلکہ اسے برابر یاد کرتی ہے لیکن وہ وقت دکھاوے کا تھا۔ اب تو سورج کی شعاعیں جب جوانی میں قدم رکھتی تو وہ بستر چھوڑتی ہے۔ ہلکا سا ناشتہ کیا پھر گھر کی صفائی میں جٹ گئی۔ کمرے میں بے ترتیب پڑے کپڑوں، اخباروں اور دوسری بکھری چیزوں کو موزوں جگہ پر رکھتی۔ ڈرائنگ روم اور بیڈروم میں ڈسٹنگ کرتی۔ تمام چیزوں کو صاف کرکے اپنی جگہ پر سلیقہ سے سجاتی پھر کمرے میں اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کچن کا رخ کرتی۔ کچن کے بکھرے سامانوں کو اکٹھا کرتی تاکہ برتن صاف کرنے والی آیا کو کوئی دشواری نہ ہو۔ اسی بیچ میکہ والوں کا فون آجاتا۔ کچن سے نکل کر وہ بالکونی میں فون پر باتیں کرنے لگتی۔ یہ موبائل بھی کیا شے ہے کہیں نیٹ آتا ہے تو کہیں نہیں۔ نیٹ نہ آنے کی وجہ سے بات چیت نہیں ہوتی۔ باتوں کا سلسلہ اتنا طویل ہوتا ہے کہ وقت کا احساس نہ ہوتا۔ اچانک ساس کی نظر کچن میں گئی انھیں احساس ہوا کہ لنچ کا وقت ہو رہا ہے کچھ ہی دیر میں سسر آجائیں گے۔ اگر کھانا تیار نہ ملا تو زلزلہ آسکتا ہے۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر وہ اٹھیں۔ کچن میں جاکر روٹی سبزی تیار کی بات کرتے کرتے ایک بار فریدہ کچن میں آئی۔ کھانا تیار رکھا تھا۔ چلو دن کا مرحلہ تو کٹا۔ اب رات کا مسئلہ دیکھا جائے گا اس نے سوچا پھر فون پر باتوں میں مشغول ہوگئی۔

کچن سے نکل کر ساس اپنے کمرے میں گئی۔ پلنگ پر تھوڑا آرام کیا پھر اٹھ کر کپڑوں کے کترن کی گٹھری اٹھائی اور سلائی مشین لے کر بیٹھ گئیں۔ تنہا دل کو بہلانے کے لیے اپنی چالیس سالہ جہیز کی مشین سے دل کے دکھ درد کو بیان کرتی اور اس کے نوک پلک درست کرکے پرانے یا نئے کپڑے کے کترن کو جوڑ کر نئی نئی ڈیزائن دے کر ایک نئی شکل بنا ڈالتی ہیں۔ اس فن میں وہ ماہر ہیں دل بھی بہل جاتا ہے اور وقت بھی گزر جاتا ہے۔ ساس کی خواہش ہوتی ہے کہ بہو ان کے قریب چند منٹ کے لیے آکر بیٹھے اپنے والدین اور بھائیوں کی خیریت بیان کرے۔ بڑے بھائی کا رشتہ کہیں طے ہوا یا نہیں۔ چھوٹے بھائی کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے۔ اللہ میرے گھر میں وہ دن کب آئے گا جب میں اپنے کھلونے کی ناپ کا خوبصورت بیل بوٹا ٹانگ کر نئی ڈیزائن کا کپڑا تیار کروں گی۔ سوچتے سوچتے آنکھوں میں کھارا پانی چھلک اٹھا۔ عصر کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے اور وہ مشین بند کرکے وضو کرنے چلی جاتی ہیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر بہت سکون ہوتا ہے۔

"اچانک ساس کی نظر کچن میں گئی انھیں احساس ہوا کہ لنچ کا وقت ہو رہا ہے کچھ ہی دیر میں سسر آجائیں گے۔ اگر کھانا تیار نہ ملا تو زلزلہ آسکتا ہے۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر وہ اٹھیں۔ کچن میں جاکر روٹی سبزی تیار کی بات کرتے کرتے ایک بار فریدہ کچن میں آئی۔ کھانا تیار رکھا تھا۔ چلو دن کا مرحلہ تو کٹا۔ اب رات کا مسئلہ دیکھا جائے گا اس نے سوچا پھر فون پر باتوں میں مشغول ہو گئی"

وہ اپنے خیالوں تھیں۔ ان کے دماغ میں ایک لاوا پک رہا تھا۔ گلے میں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ ادھر کچھ دنوں سے سسر کی شوگر بڑھی تھی۔ یہ مرض بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ آنکھیں خواب دیکھنے سے باز نہیں آتیں۔ سسر ریٹائر ہو گئے۔ اب ساری جھنجھٹ سے نجات پاگئے۔ اپنی مرضی سے اٹھتے، اپنی مرضی سے سوتے مگر یہ موذی مرض سونے دے تب نا۔ لاکھ پرہیز کیجیے مختلف دواؤں کا استعمال کریں مگر وہ مرض اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں۔ فریدہ اپنا زیادہ وقت گھر کی صفائی اور اپنے میکہ والوں سے فون پر باتیں کرنے میں مصروف رہتی لیکن تمام مصروفیتوں کے باوجود کبھی کبھی سسر کی خبرگیری کرتی رہتی نہ چاہتے ہوئے وہ ان کی دواؤں کے اوقات پر دوا دینا نہیں بھولتی۔ وہ جتنا چاہتی کہ اس ماحول سے بھاگ جائے اتنا ہی بوڑھے کی بجھی آنکھوں میں لاچاری دکھائی دیتی اور اس لاچاری کو دیکھ کر دل میں ترس آتا اور وہ لپک کر ان کے قریب جاتی، ان کی ضروریات کو مہیا کرنے کی کوشش کرتی۔ سسر کی شخصیت میں ایک ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ وہ ان سے الگ نہیں ہو پاتی۔ ان سے دور رہنا چاہتی ہے پھر ایسا محسوس ہوتا کہ سسر کے آس پاس کوئی ایسی زنجیر ہے جس میں اس کے قدم جکڑے ہیں۔

ایک شام بعد مغرب ساس نے اسے اپنے قریب بلایا۔ وہ خاموشی سے آکر ساس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ساس نے شفقت سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آخر کار ساس نے خاموشی کا حصار توڑا۔ دبے دبے لہجے میں آنکھیں فریدہ کے چہرے پر گاڑ کر ساس نے کہنا شروع کیا جیسے وہ اپنے دل میں چھپی ہوئی پھانس آہستہ آہستہ نکال رہی ہوں۔

”ایک شام بعد مغرب ساس نے اسے اپنے قریب بلایا۔ وہ خاموشی سے آکر ساس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ساس نے شفقت سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آخر کار ساس نے خاموشی کا حصار توڑا۔ دبے دبے لہجے میں آنکھیں فریدہ کے چہرے پر گاڑ کر ساس نے کہنا شروع کیا جیسے وہ اپنے دل میں چھپی ہوئی پھانس آہستہ آہستہ نکال رہی ہوں۔“

”بیٹا تمھاری نظر میں ایک ساس ہوں یعنی تمھارے شوہر کی ماں اور تم بہو۔ یہ رشتہ جسے ہم ساس اور بہو کے نام سے پکارتے ہیں، دراصل یہ الفاظ بہت تکلیف دہ ہیں، یہ رشتہ ماں بیٹی کا رشتہ ہے۔ وہ لڑکی جو کسی دوسرے گھرانے میں پیدا ہوتی ہے اور پرورش پاتی ہے پھر ایک دن ایسا آتا ہے جب وہ اپنے اس گھر کو چھوڑ کر دوسرے گھر میں قدم رکھتی ہے وہی اس کا اصل گھر ہوتا ہے......“ فریدہ چپ چاپ نظریں جھکائے ساس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ ماضی کی تلخ یادوں سے ایک دم حال میں آ پہنچی۔ ساس کی آواز ابھی بھی اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

”بیٹا! میں تم سے یہ نہیں کہتی کہ تم اپنے والدین یا بھائیوں کو بھول جاؤ۔ ان سے رشتہ توڑ دو، ان سے جدا ہو جاؤ۔ ارے پانی پر لاٹھی مارنے سے کبھی پانی جدا ہو سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ تم اپنے ماں باپ بھائیوں سے ضرور ملو اپنے دل کے تمام دکھ درد کی کہانی انھیں سناؤ، تمھاری نندیں تم سے کیسی پیش آتی ہیں، ضرور بتاؤ۔ تمھارے ساتھ میرا یا تمھارے سسر کا کیا برتاؤ ہے، ان کے علم میں ضرور لاؤ تا کہ انھیں پتہ چلے کہ ان کی اولاد کی نئی زندگی کیسی ہے؟ لیکن ایک وقت مقرر کر لو۔ گھر کے سارے کاموں میں فرصت پانے کے بعد، اپنی تمام ذمہ داریوں کو ختم کرنے کے بعد تا کہ کسی کو

تم سے شکایت کا موقع نہ ملے۔ ان میں شوہر سب سے افضل ہے، جس کی اہمیت اللہ تعالیٰ کے بعد، اس کے احکام کو ماننا تمھارے لیے اہم ہے۔ بیٹا میں تم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ میری اپنی بیٹیاں اپنے گھر کی ہوئیں۔ تم ہی واحد میری زندگی کا سہارا ہو۔ میری اپنی بیٹی۔ اس گھر کی وارث۔“ ساس نے اظہار محبت کو عیاں کرنے کے لیے منھ میں جو بھی الفاظ آئے سرعت کے ساتھ ادا کر دیے۔ فریدہ ان کا چہرہ تکتی رہی۔ وہ شش و پنج میں گرفتار ہوگئی۔ ساس کے فکر مند چہرے کو دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں آنسو تڑپنے لگے، اور وہ لپک کر ساس کے قدموں میں جھک گئی......“ مجھے معارف کردیں ممی، مجھے آپ کو سمجھنے میں دیر لگی۔ میں آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔

ساس بھی ایک ماں ہوتی ہے۔ مامتا، چاہت اور محبت سے بھرپور ماں، جو اپنے بچوں سے بے پناہ پیار کرتی ہے۔ وہ تڑپ اٹھی......’میری بچی...... میری لال......‘ یکبارگی مانوس سی آواز نے فریدہ کو بھیانک خیالات کے دلدل سے نکال کر اپنے سینہ سے لگا لیا۔

□□□

Zaira Husaini
D/495 Deryabad
Prayagraj-211003 (U.P)

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا

میں عورت ہوں

دل دیا ہے میری جاں میں نے مگر
یہ نہ سمجھو کہ غلامی کی ہے
میرا احساس میرا اپنا ہے
میرے جذبات میرے اپنے ہیں
میرا وہ بول گواہوں نے سنا تھا جس کو
وہ میری روح کے بکنے کا تو پیمان نہ تھا
جسم پر حق ہے مگر روح میری اپنی ہے
ذہن پر قید نہیں سوچ میری اپنی ہے
ہم سفر ہو تو میرے ساتھ میں چلنا سیکھو
ہم نفس بن کے میری سانس میں گھلنا سیکھو
ہم نظر بن کے مجھے عزت دو
اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر کم سے کم
میری سوچوں کو مقید نہ کرو
سانس لینے کے لیے کوئی جھروکا تو رکھو
میں تمھاری ہوں تمھاری ہی رہوں گی جاناں
ہاں مگر تم بھی میرے دل میں اترنا سیکھو

Dr. Naeema Jafri Pasha
144 Ground Floor, Poket 2
Jasola
New Delhi-110025

سائرہ عظیم

خود اپنے آپ کو دیکھو اگر ایمان ہے پیارے
کسی کا تجزیہ کرنا بہت آسان ہے پیارے

کھرے کھوٹے کو پہچانو برے اچھے کو دیکھو تم
تمھارے پاس کوئی بھی اگر میزان ہے پیارے

تمھارے پاس بیٹھا ہے تمھاری بات مانے گا
کرو عزت تم اس کی بھی وہ اک انسان ہے پیارے

کوئی حکمت نہیں آتی کوئی سازش نہیں آتی
زمانے کا کوئی غم بھی نہیں نادان ہے پیارے

اطاعت حکم کی کرنا مجھے آتا نہیں لیکن
بجالاؤں اُسے بھی میں کوئی فرمان ہے پیارے

سبھی نے باندھ رکھا ہے یہاں رختِ سفر لیکن
ہر اک انسان پھر بھی بے سرو سامان ہے پیارے

عجب دنیا مری دنا مجھے کیا سائرہ غم ہے
اکیلی گھر میں رہتی ہوں یہی پہچان ہے پیارے

(بحوالہ: بند دریچے، سائرہ عظیم، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

ڈاکٹر مسرور صغریٰ

خارستان

ستم ایجاد جدا پھول سے خوشبو کر دیں
تیر بلبل کے کلیجے میں ترازو کر دیں
راہ کے سنگ چمکنے لگیں ایوانوں میں
خاک اڑنے لگے بھارت ترے کاشانوں میں
کون سا رنگ سجے گا تری پیشانی پر
کس کو تمغے دیے جائیں گے نگہبانی پر
لفظ جو کاٹ دے شمشیر کو، لے کر آؤ
اپنے آئین کی تفسیر تو لے کر آؤ
کیا ہواؤں سے چراغوں کو ڈرا سکتے ہو
شعلۂ عزم ہواؤں سے بجھا سکتے ہو
کیا سمجھتے ہو ہمیں حق کی خبر ہے ہی نہیں
میرے نعلوں میرے نعروں کا اثر ہے ہی نہیں
ہم گریبان تمھارا بھی پکڑ سکتے ہیں
شر کے بیباک ارادوں کو جکڑ سکتے ہیں
تم نے دیکھے نہیں تیور ابھی انگاروں کے
ہم مسیحا ہیں مگر نقرئی مہ پاروں کے
کبھی سورج کو سر دار چڑھا سکتے ہو
اور سبق فرقہ پرستی کا پڑھا سکتے ہو
تم ہواؤں کو مقید کہیں کر سکتے ہو
کسی نا اہل کو جید نہیں کر سکتے ہو

تاج عزت کا کہو سر پہ سجایا کس نے
تمھیں اک ذرے سے مرجان بنایا کس نے
کون رہزن ہے جو رہبر کا لبادہ اوڑھے
چھپ کے بیٹھا ہے تباہی کا ارادہ اوڑھے
خوف مالک کا کرو جھوٹ کے منتر نہ پڑھو
لے کے ہمراہ گناہوں کا یہ لشکر نہ چلو
کیا ضروری ہے کہ ہر بار ہمیں زخم لگے
درد و ایذا کی نمائش کے لیے بزم سجے
کچھ تو افلاس میں بھارت کی کمی لے آؤ
عہد و پیماں کے جزیروں میں نمی لے آؤ
کیا سبق عدل اور انصاف کا تم بھول گئے
کبھی خوشبو کو بچانے کے لیے پھول گئے
جب سے بارود پلائے گئے میخانوں میں
نشہ ظلم بڑھا جاتا ہے مے خواروں میں
نشہ یہ اوج پہ آ آ کہ اتر جاتا ہے
زد میں منصف کی جب آجاتا ہے بکھر جاتا ہے
چاند کو قید کرے چاندنی آزاد رہے
کسی درویش کی خواہش ہے تو برباد رہے
خنجر ظلم کو پھر کند کرو ہم وطنو
زیست کی شمع کو پھر تند کرو ہم وطنو

Dr. Masrur Sughra
Assistant Professor
Urdu (Guest Faculty) CM Arts College
Quilaghat
Darbhanga846004 (Bihar)

لذیذ پکوان

لڈو پیٹھیاں

لڈو پیٹھیاں کے لیے: چنے کی دال دو سو پچاس گرام، سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ، اجوائن ایک چوتھائی چائے کا چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ، بیکنگ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، تیل تلنے کے لیے

خوبانی کی چٹنی کے لیے: خوبانی ایک سو پچیس گرام (سوکھی)، نمک آدھا چائے کا چمچ، لال مرچ آدھا چائے کا چمچ (پسی ہوئی)، زیرہ ایک چائے کا چمچ، چینی آدھا کپ، پانی ایک کپ

املی کی چٹنی کے لیے: املی کا رس ایک کپ (گاڑھا)، چھوہارے چھ عدد، لال مرچ ایک چائے کا چمچ (پسی ہوئی)، نمک آدھا چائے کا چمچ، زیرہ ایک چائے کا چمچ، سرکہ ایک کھانے کا چمچ، گڑ آدھا کپ

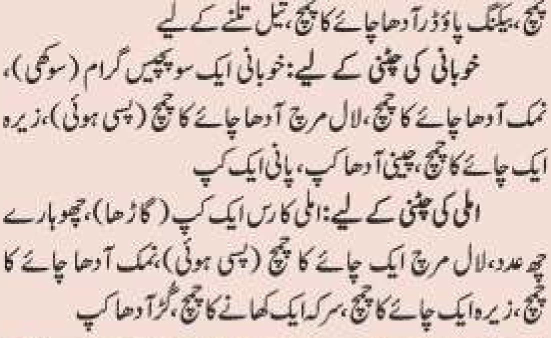

سلاد کے لیے: مولی آدھی، گاجر آدھی، بند گوبھی آدھی

ترکیب: 1. لڈو پیٹھیاں کے لیے چنے کی دال کو رات بھر کے لیے بھگودیں۔

2. پھر اس کا پانی نکال کر اس کو سفید زیرہ، اجوائن اور نمک کے ساتھ بلینڈ کرلیں۔

3. فرائی کرنے سے پہلے اس میں بیکنگ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔

4. پھر بیٹر کو کھانے کے چمچ کی مدد سے گرم تیل میں ڈالیں اور لڈو پیٹھیاں تل لیں۔

5. اس کے بعد انھیں نکال کر تیار چٹنیوں اور سلاد کے ساتھ سرو کریں۔

6. خوبانی کی چٹنی کے لیے: ایک پین میں سوکھی خوبانی، نمک، پسی لال مرچ، زیرہ، چینی اور ایک کپ پانی کو پکالیں۔

7. پھر اسے بلینڈ کرلیں۔

8. املی کی چٹنی کے لیے: چھوہاروں کو رات بھر کے لیے بھگودیں۔

9. اب انھیں ایک پین میں املی کے رس، لال مرچ، نمک، زیرہ، سرکہ اور گڑ کے ساتھ پکالیں، یہاں تک کہ چٹنی گاڑھی ہوجائے۔

10. پھر اسے نکال کر ٹھنڈا کریں اور بلینڈ کرلیں۔

11. سلاد کے لیے: ایک پیالے میں مولی، گاجر اور بند گوبھی کو کدوکش کریں اور لڈو پیٹھیوں کے ساتھ سرو کریں۔

ہاٹ اینڈ اسپائسی ریشمی کباب رولز

اجزا: چکن کا قیمہ آدھا کلو، گرم مصالحہ ایک چائے کا چمچ، بھنا اور پسا

زیرہ ایک چائے کا چمچ، پسی ہری مرچ ایک چائے کا چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ، کُٹی لال مرچ ایک کھانے کا چمچ، ادرک لہسن پیسٹ ایک کھانے کا چمچ، کارن فلور ایک کھانے کا چمچ، سفید مرچ آدھا چائے کا چمچ، پسا کھوپرا تین چائے کے چمچ، گھی دو کھانے کے چمچ، چھلے اور پسے بادام دو کھانے کے چمچ، بھنا اور کُٹا دھنیا ڈیڑھ چائے کا چمچ

چٹنی کے لیے: دہی ایک کپ، پسی ہری مرچ ایک چائے کا چمچ، چاٹ مصالحہ ایک چائے کا چمچ، پسی لال مرچ آدھا چائے کا چمچ، نمک ایک چوتھائی چائے کا چمچ

پراٹھے کے لیے: میدہ ڈھائی کپ، تیل ایک کھانے کا چمچ، نمک آدھا چائے کا چمچ، پانی گوندھنے کے لیے

پیسٹ بنانے کے لیے: انڈے کی سفیدی ایک عدد، پگھلا ہوا گھی دو کھانے کے چمچ، میدہ دو کھانے کے چمچ

ترکیب: 1. چکن کے قیمے کو چھلے اور پسے بادام، پسا کھوپرا، گرم مصالحہ، بھنا اور پسا زیرہ، کُٹی لال مرچ، سفید مرچ، نمک، بھنا اور کُٹا دھنیا، پسی ہری مرچ، ادرک لہسن کا پیسٹ، گھی اور کارن فلور سے میرینیٹ کریں۔

2. اب انھیں اچھی طرح مکس کر کے اسکیورز پر لگائیں۔

3. پھر انھیں ایک سو اسی سینٹی گریڈ پر بیس منٹ باربی کیو یا بیک کر لیں۔

4. آخر میں کوئلے کا دم دے کر پراٹھوں کے ساتھ سرو کریں۔

5. (چٹنی بنانے کے لیے)

6. دہی پھینٹ کر اس میں پسی لال مرچ، چاٹ مصالحہ، نمک اور پسی ہری مرچ ڈال کر رول کے ساتھ سرو کریں۔

7. (پراٹھے بنانے کے لیے)

8. میدے کو نمک اور حسب ضرورت پانی کے ساتھ گوندھ لیں۔

9. اس ڈو کے آٹھ پیڑے بنائیں۔ ہر پیڑے کو چھوٹی پلیٹ کے برابر بیل لیں، اس پر تیار شدہ پیسٹ لگائیں۔

10. اسے دوبارہ رول کریں اور اس کا دوبارہ پیڑا بنا کر بیل لیں۔

11. آخر میں اسے گرم تیل میں فرائی کر کے پراٹھا بنا لیں۔

12. ہر پراٹھے پر ایک ریشمی کباب رکھیں۔

13. تھوڑی سی چٹنی ڈالیں اور رول کر کے گرم گرم پیش کریں

آلو پاپڑی چاٹ

اجزا: آلو آدھا کلو چھوٹے، پاپڑی چھ عدد (چورا کی ہوئی)، دال سیو ایک پیکٹ، تیل ایک چوتھائی کپ، کڑی پتے آٹھ سے دس عدد، زیرہ ایک کھانے کا چمچ، رائی آدھا چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، لال مرچ ایک چوتھائی چائے کا چمچ، ہلدی ایک چائے کا چمچ، املی کا گودا ایک چوتھائی کپ، چاٹ مصالحہ ایک چوتھائی چائے کا چمچ، ہری مرچ چار عدد

ترکیب: 1. پہلے آلوؤں کو چھیل کر اُبال لیں۔

2. اب ایک پین میں ایک چوتھائی کپ تیل گرم کر کے اس میں کڑی پتے، زیرہ اور رائی ڈال کر فرائی کریں۔

3. ساتھ ہی اس میں نمک، لال مرچ، ہلدی اور املی کا گودا ڈال کر تھوڑا بھونیں۔

4. اس کے بعد اس میں آلو، چاٹ کا مصالحہ اور ہری مرچ شامل کر کے مکس کریں اور اُتار لیں۔

5. اب اسے ڈش میں نکال کر چورا کی ہوئی پاپڑی اور دال سیو ڈال کر سرو کریں۔

(بحوالہ از: www.khanapakana.com)

محمد طاہر صدیقی

توانائی اور طبی افادیت سے بھرپور
مختلف ذائقہ دار پھل

اللہ رب العزت نے ہمارے کھانے پینے کے لیے جو اشیا پیدا کی ہیں ان میں پھل ہماری غذا کا بنیادی اور اہم جز ہیں۔ ہر پھل بہت اچھا اور لاتعداد خواص کا حامل ہے۔ ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو کہ خود ایک مکمل غذا کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسے پھلوں میں کیلا، انار، چیکو، لیچی، پپیتا، بیر، جامن، اسٹرابیری، خربوزہ، کھجور وغیرہ پھلوں میں قدرت نے اپنی قدرت سے پھلوں میں کئی فوائد رکھے ہیں۔ جس کے بارے میں ہم جانکاری حاصل کر کے عمل میں لاسکتے ہیں۔

کیلا:۔(ذائقہ دار لذیذ پھل)

پھلوں میں ایک پھل کیلا بھی ہے جو کہ سدابہار پھل ہے۔ اپنے ذائقہ دار لذت کی وجہ سے کیلا ایشیا کا پسندیدہ اور شاید ہندوپاک کا سب سے پسندیدہ پھل مانا جاتا ہے۔ اس لیے ہر بڑے اور چھوٹے کا پسندیدہ ہے۔ یہ سستا بھی ہوتا ہے اور بآسانی دستیاب ہوتا ہے۔ اس کا ذائقہ اور لذت دوسرے پھلوں سے منفرد ہے۔

کیلے کے متعلق یقینی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب سے پہلے کہاں اور کب پیدا ہوا لیکن رومن مورخ پلائی کے مطابق 227 قبل مسیح سکندر اعظم نے سب سے پہلے اسے وادی سندھ میں دیکھا۔ دراصل کیلے کی مقبولیت اور اس کو پسند کیے جانے کی وجہ اس کے غذائی اجزا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غذائی ماہرین دودھ کے بعد کیلے کو ایک مکمل غذا قرار دیتے ہیں۔ اس میں وٹامن "اے، بی، اور سی" کے ساتھ مناسب مقدار میں پوٹاشیم بھی موجود ہوتا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ مقدار میں نشاستے پائے جاتے ہیں۔ ایک عام کیلے میں 80 سے 100 کیلوریز (حرارے) ہوتے ہیں۔ یہ پھل طالب علموں اور کھلاڑیوں کے لیے بہت مفید ہوتا ہے کیونکہ یہ فوری توانائی پیدا کرتا ہے۔ کیلے میں چونکہ چکنائی، کولیسٹرول اور سوڈیم کم مقدار میں پایا جاتا ہے اس لیے اس کا استعمال موٹاپے سے پریشان لوگوں کے لیے بہت مفید ہے۔

جدید طبی تحقیق کے مطابق کیلا معدے اور آنتوں کے زخم (السر) کے مریضوں کے لیے بہت مفید پھل ہے۔ کیلا صرف آج ہی نہیں بلکہ قدیم دور سے دوا کے طور پر استعمال ہوتا آرہا ہے۔ گردے اگر مکمل طور پر کام نہ کریں تو خون میں سوزش ہونے لگتی ہے کیلا اس سوزش کو کم کرتا ہے۔ کیلے کو نہار منہ نہیں کھانا چاہیے۔ کیلوں کو دودھ میں پکا کر اس کی کھیر کھانے سے جسم کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

انار (ذائقہ دار بے شمار طبی فوائد کا حامل پھل)

انار ذائقہ دار بے شمار طبی فوائد کا حامل پھل ہے۔ یہ بہت ہی مفید

پھل ہے۔اللہ تعالیٰ نے انار کو تاجدار پھل بنایا ہے۔کچھ لوگ انار کو محض اس لیے پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ ترش ہوتا ہے۔لیکن اس کی تمام اقسام ترش نہیں ہوتیں بلکہ انار کی بعض اقسام تو اپنے اندر شہد کی سی مٹھاس لیے ہوتی ہیں۔کہا جاتا ہے کہ انار کا اصل وطن ایران ہے اور اس کی باقاعدہ کاشت بھی سب سے پہلے وہیں شروع ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے انار کو جنت کا ایک پھل قرار دیا ہے۔انار کا مزاج سرد اور تر ہے۔یہ پھل پوری دنیا میں پایا جاتا ہے اور اطباء انسانی جسم کے لیے اس کے متعدد خواص بیان کرتے ہیں۔انار میں فولاد اور ہائیڈروکلورک ایسڈ موجود ہوتا ہے۔اس کے کھانے سے بھوک کھل کر لگتی ہے۔انار کا رس فرحت بخش اور سکون آور ہوتا ہے۔اس میں وٹامن ”اے اور بی“ کی کافی مقدار موجود ہوتی ہے جو جسم کو تقویت بخشتی ہے۔معدے کو مضبوط بناتا ہے اور غذا کو جلد ہضم ہونے میں مدد دیتا ہے۔جگر اور آنتوں کو بھی قوت بخشتا ہے خون صاف کرتا ہے۔ورم، جگر، یرقان، سینے کے درد، گرم کھانسی، تلی کے امراض میں مبتلا مریضوں کے لیے انار کا استعمال بہت مفید ہے۔

چیکو: (معدہ اور آنتوں میں بہت مفید پھل)

چیکو برصغیر کے پسندیدہ پھلوں میں سے ایک ہے۔ہمارے ملک میں اس کی کاشت پرتگالیوں کے زمانے سے ہو رہی ہے۔ہمارے ملک کی آب و ہوا چیکو کے لیے موافق ہے۔یہ اپریل اور جون میں پھل دیتا ہے۔خوش ذائقہ دار میٹھا ہونے کی وجہ سے بہت جلد ہر لعزیز پھلوں میں اس کا شمار ہونے لگا ہے۔قدرت نے اس پھل میں بہت سے طبی فوائد پوشیدہ کر رکھے ہیں۔یہ پھل امراض معدہ اور آنتوں کے لیے بہت مفید ہے۔یہ پیاس کی شدت کو کم کرتا ہے۔جسم کی گرمی کو ختم کر کے دل کو تقویت دیتا ہے۔

چیکو میں وٹامن، معدنی نمک اور مٹھاس کافی مقدار میں موجود ہوتی ہے۔یہ ایک طاقت بخش پھل ہے۔صبح کے وقت 5 سے 6 چیکو کھا کر ایک گلاس دودھ پینے سے چیکو ایک بہترین ناشتہ بن جاتا ہے۔چیکو خوش ذائقہ ہونے کے ساتھ ساتھ غذائیت سے بھرپور ہے۔اس میں سب سے بڑی مقدار میں وٹامن ”اے“ پائی جاتی ہے۔یہ وٹامن کئی امراض سے قوت مدافعت پیدا کرتا ہے۔چیکو سے خون کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔بدن کو صحت مند رکھنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

لیچی: (نفیس، مزے دار اور فائدے مند پھل)

کھٹی میٹھی لیچی گرمیوں کا خاص پھل ہے۔ماہرین کے مطابق اس موسم میں لیچی کا استعمال نہایت ہی مفید ہے۔لیچی میں باہر کی طرف ایک پتلا اور سخت سرخ گلابی چھلکا ہوتا ہے۔اس کے اندرونی جانب ایک جھلی ہوتی ہے جس میں لیچی کا سفید گودا بڑے سے بیج کے ساتھ لپٹا ہوتا ہے۔گودے کا ذائقہ نہایت شیریں اور خوش مزہ ہوتا ہے۔یہ پھل نہایت حساس اور پیڑ سے اتارنے کے بعد بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔

لیچی کے درخت کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں پھول لگتے ہی شہد کی مکھیاں پائی جاتی ہیں اور اس سے تیار ہونے والی شہد انتہائی عمدہ ہوتی ہے۔لیچی ایک عمدہ اور نفیس صحت بخش پھل ہے۔لیچی میں ”کیلشیم، میگنیشیم، پوٹاشیم، سوڈیم اور وٹامن اے، بی، سی“ پائی جاتی ہے۔لیچی دماغ کو طاقت دیتی ہے۔دل کی کمزوری اور دھڑکن ایک دم تیز ہو جانے میں بہت زیادہ مفید ہے۔دو سے تین دانے اور چھ چھ گھنٹے کے بعد کھانے سے خون صاف کرتی ہے۔لیچی کا استعمال ہر قسم کے کینسر سے بچاتا ہے۔روزانہ سو گرام لیچی کا استعمال پورے دن کی وٹامن ”سی“ کی ضرورت پوری کر دیتا ہے۔لیچی میں چکنائی بہت کم ہوتی ہے، جس کی وجہ سے یہ پھل تمام عمر کے افراد کے لیے فائدے مند ہے۔

پپیتا: (طبی خوبیوں، صحت اور خوبصورتی بڑھانے کی صلاحیت سے بھرپور پھل)

غذائیت سے بھرپور ”پپیتے“ میں قدرت نے بے پناہ فوائد رکھے ہیں۔پپیتا وٹامنز اور انزائمز کا بہترین ذریعہ ہے۔ماہرین صحت و غذائیت

کے مطابق پپیتے کا تعلق پھلوں کے اس گروپ سے ہے جو اینٹی آکسیڈنٹس کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ پپیتے میں وٹامن ’’سی، بی اور ای‘‘ کے علاوہ فاسفورس اور پوٹاشیم بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ انسانی صحت پر موثر اثرات مرتب کرتے ہیں۔ پپیتے میں کئی ایسے Nutrient ہوتے ہیں جو کئی طرح کی بیماریوں سے جسم کو دور رکھتے ہیں۔ پپیتے میں Karpen Or Carpein عنصر ہوتا ہے جو بلڈ پریشر کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس لیے بلڈ پریشر کے مریضوں کو پپیتا روزانہ کھانا چاہیے۔ اچھے پکے پپیتے کے گودے کا ابٹن کی طرح چہرے پر لیپ کریں۔ جب یہ سوکھ جائے تو گرم پانی سے چہرہ دھولیا جائے۔ ایسا کم سے کم ایک ماہ تک کرنے سے چہرے کی جھریاں دور ہو جاتی ہیں۔ جن لوگوں کو قبض کی شکایت رہتی ہے انھیں رات کو کھانے کے بعد پپیتا کھانا چاہیے۔ یہ ان کے لیے بہت زیادہ مفید ہوتا ہے۔

بیر: (ذائقہ، وٹامن بی اور فولاد کا خزانہ)

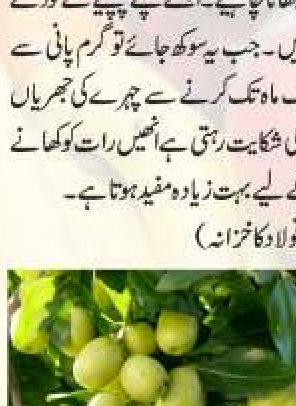

بیر کا باغ و بہار قسم کا درخت برصغیر میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ خوب گھنا اور تناور ہونے کی خوبی کے ساتھ ساتھ اس کا پیڑ خاردار اور سدابہار ہوتا ہے۔ اس کے پھول سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں جن کی شکل بالکل ناک میں پہننے والے زیور لونگ جیسی ہوتی ہے۔

بیر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جنگلی بیری جو عموماً جھاڑی کی شکل کی ہوتی ہیں اور دوسری عام یعنی گھریلو بیر۔ جنگلی بیر کو جھڑ بیری بھی کہتے ہیں یہ خودرو ہوتی ہے۔ اس کا پھل عام طور پر چھوٹا اور گول ہوتا ہے۔ دوسری قسم کاشت کی جاتی ہے۔ اس کا پھل بیضوی، گداز، گودادار اور ساخت میں بڑا ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی قسم کے برعکس شیریں ہوتا ہے۔ قدرت نے اس خوبصورت پیڑ کے پھل، چھال اور پتوں میں غذائی اور ادویاتی خواص رکھے ہیں۔ اس کا پھل یعنی بیر وٹامن ’’بی‘‘ کا خزانہ ہے۔ اس کے علاوہ ’’اے اور ڈی‘‘ وٹامن بھی اس کے حصے میں آئی ہیں۔ معدنیات میں فولاد، کیلشیم، پوٹاشیم اور فلورین اس میں شامل ہیں۔

طب یونانی کے مطابق اس کا مزاج سرد ہے اور یہ جسم میں گوشت بنانے کی صلاحیت سے مالامال ہے۔ ان خواص کی روشنی میں آپ اس کے تعمیری افعال کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ بیری کی چھال اسہال، پیچش اور قولنج کے علاج میں نہایت موثر ہے۔ اندرونی چھال کا جوشاندہ قبض کی حالت میں جلاب کے طور پر دیا جاتا ہے۔ ایسے ذہنی مریض جن کا دماغ بہت سست ہو ان کے علاج کے لیے مٹھی بھر خشک بیر آدھ لیٹر پانی میں اس وقت تک ابالے جائیں جب تک پانی آدھا نہ رہ جائے۔ پھر اس آمیزے میں شہد یا چینی ملا کر روزانہ رات کو سونے سے قبل مریض کو کھلایا جائے۔ یہ علاج دماغ کی کارکردگی بڑھا کر مریض کو فعال بنا دے گا۔

بیر کی ٹہنیوں اور پتوں کا لیپ پھوڑوں اور پھنسیوں وغیرہ پر لگانے سے پیپ جلد پک کر خارج ہو جاتی ہے۔ سر پر بیر کے پتوں کا لیپ لگانا بالوں کو صحت مند اور خوشنما بناتا ہے۔ اس سے بال سیاہ ہوتے ہیں۔

جامن: (صحت بخش اور طبی افادیت سے بھرپور)

جامن غذا بھی ہے اور دوا بھی ہے۔ یہ ذیابطیس کو قابو میں رکھنے میں انتہائی مفید ہے۔ اس میں شامل گلوکوسائڈ، نشاستے کو گلوکوز میں شامل ہونے سے روکتا ہے۔ جامن کا موسم نہ ہونے کی صورت میں اس کی گٹھلیوں کا سفوف تین گرام صبح نہار منہ اور شام پانچ بجے کھانا چاہیے۔ ذیابطیس کے مرض میں جامن کا سرکہ بھی موثر ہے۔ بشرطیکہ وہ قدیم قدرتی طریقے سے تیار شدہ ہو، تیزابی یا مصنوعی نہ ہو۔ جامن کے استعمال سے خون کا گاڑھاپن اور تیزابیت ختم ہو جاتی ہے۔ پھوڑے پھنسیوں سے محفوظ رہنے کے لیے جامن نہایت مفید ہے۔ جامن بلڈ کینسر مرض کے ازالہ میں معاون ہے۔

جامن حیاتین ’’ج‘‘ وٹامن ’’سی‘‘ کا قدرتی ذریعہ ہے۔ اس لیے جن لوگوں کو وٹامن سی کی کمی کے نتیجے میں مسوڑھوں سے خون آتا ہے جامن کے استعمال کے ساتھ ساتھ اس کے پتوں سے بھی استفادہ کریں۔ موسم گرما اور برسات میں اسہال اور دیگر پیٹ کے امراض کے لیے جامن کا سرکہ انتہائی فائدہ مند ہے۔ یہ صدیوں سے مستعمل ہے۔

اسٹرابیری: (ذائقہ دار ہی نہیں فائدہ مند بھی)

شگفتہ سرخ رنگت اور سر پر سبز پتوں کا تاج لیے دل کی شکل سے مشابہ اسٹرابیری گلاب کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اسے ’’محبت کی

علامت اور صحت کی ضمانت'' بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ پھل ذائقہ دار ہی نہیں بلکہ غذائیت بخش بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کو غذا کا حصہ بنانا مفید ہے۔ اس کا شمار دنیا کے لذیذ ترین پھلوں میں ہوتا ہے۔ اسٹرابیری وہ واحد پھل ہے جس کا بیج اس کے چھلکوں میں ہوتا ہے۔

اس کا استعمال انسان کو کئی بیماریوں سے دور رکھتا ہے۔ اس میں موجود اینٹی آکسیڈنٹ آپ کے جسم میں یورک ایسڈ کی مقدار کو زیادہ بننے نہیں دیتی جس سے آپ بھوک محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے وہ افراد جنھیں بھوک نہ لگنے کی شکایت رہتی ہو وہ اس کا استعمال خاص طور پر کریں۔ اسٹرابیری میں افادیت اور ذائقہ ہے۔ یہ ذائقہ کے ساتھ ساتھ صحت کا سامان بھی مہیا کرتی ہے۔ یہ خون کی گاڑھی چکنائیوں کی سطح کو کم کر کے خون کو پتلا کرتی ہے۔ اسٹرابیری کھانے سے قوت مدافعت بحال رہتی ہے جس کی وجہ سے نزلہ، زکام وغیرہ بیشتر اقسام کے انفیکشن سے جسم محفوظ رہتا ہے۔

خربوزہ: (طبی افادیت سے بھرپور پھل)

قدرت نے اپنی قدرت کاملہ سے پھلوں میں کئی فوائد رکھے ہیں خربوزہ بھی اس میں شامل ہے۔ خربوزے میں گلوکوز، پوٹاشیم، وٹامن ''اے اور بی'' شامل ہے۔ اس کے کھانے سے جسم سے فاسد مادے خارج ہو جاتے ہیں۔ یرقان، پتھری، بندش پیشاب جیسے امراض میں مفید ہے۔ خربوزے کا چھلکا بیج سب کارآمد ہیں۔ گرمی میں اگر بچوں کو کھلایا جائے تو ان کے پھوڑے پھنسیوں سے بھی آرام ملتا ہے۔ یہ پتھری کو بھی توڑتا ہے۔ لیکن یاد رکھیں کہ خالی پیٹ خربوزہ نہ کھائیں۔ دو وقت کے کھانے کے بیچ میں خربوزہ کھانا چاہیے۔ خربوزے کے کھانے کے بعد پانی بالکل نہیں پینا چاہیے۔ اس سے ہیضہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس میں موجود وٹامن ''ڈی'' صحت کے لیے مفید ہے۔ اس کو کھانے سے دل کو فرحت ہوتی ہے۔ گرمی میں اسے ضرور کھائیں تاکہ جسم کو بھرپور توانائی ملے۔

کھجور: (طبی فوائد کا خزانہ)

قرآن میں کھجور کا ذکر صرف رطب اور نخل کی صورت میں آیا ہے۔ جبکہ احادیث میں یہ آٹھ ناموں سے موسوم ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھجور بہت پسند تھی۔ پانی میں بھگو کر اس کا عرق یا شربت مفید ہوتا ہے۔ یہ معدہ کو تقویت دیتا ہے خاص کر مسوڑھوں کی سوزش میں مفید ہے۔ پھلوں میں کھجور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ جسم کے ہر حصے کے لیے یکساں مفید ہے۔ اس سے سکون اور چین زیادہ موثر ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرے ذرائع بتاتے ہیں کہ کھجور کے ساتھ بادام اور خشخاش کا استعمال مفید ہے۔ کھجور خون پیدا کرتی ہے اور جلد ہضم ہوتی ہے۔ قوت باہ کو مضبوط کرتی ہے۔ مقوی جگر و معدہ ہے۔ بدن کو فربہ کرتی ہے۔ فالج، لقوہ وغیرہ میں کافی مفید ہے۔ خشک کھانسی اور دمے میں کھجور کا استعمال انتہائی مفید ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی طرح کے مرض کے لیے فائدہ مند ہے۔

اس طرح ان تمام پھلوں کے فوائد کو دیکھتے ہوئے ہمیں اپنی صحت کے لیے ان کا استعمال کرنا چاہیے۔ کیونکہ انسان کی صحت اللہ کی طرف سے بڑی نعمتوں میں سے ہے۔ اس کی حفاظت کرنا ہر انسان کی اپنی ذمے داری اور ضرورت بھی ہے۔ اس سلسلے میں مرزا غالب نے صحت کے تعلق سے اپنا یہ شعر عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔

تنگدستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

اس طرح ہمیں اپنی صحت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی صحت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ خاص طور سے نوجوانوں کو ''مندرجہ بالا پھلوں'' کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ وہ تمام بیماریوں سے اپنی حفاظت کر سکیں اور ملک اور قوم کے لیے بہت بڑی طاقت ثابت ہو سکیں۔

❑❑❑

Mohd Tahir Siddiqui
N/139-B1
Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar
Okhla,New Delhi-110025

شہد کے 10 ناقابلِ یقین فوائد

بابائے ادویات اور نامور یونانی طبیب و فلسفی بقراط کا کہنا ہے:

غذا کو دوا اور دوا کو غذا بناؤ

جب آپ شہد کے فوائد کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بقراط کا اشارہ اس لیس دار میٹھے سیال کی طرف ہے۔

قدرتی طور پر فرکٹوس اور گلوکوس، وٹامن، معدنیات اور اینٹی آکسیڈنٹ سے بھرپور شہد، ماہرین غذائیت کی پسندیدہ غذا ہے۔ شہد کئی اقسام کی بیماریوں سے بچاؤ میں مفید ہے۔ ماضی میں بھی اسے لاتعداد بیماریوں اور جسمانی و ذہنی تکالیف کے لیے دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے جب کہ اس کا ذائقہ اور مزہ بھی اس کی پسندیدگی اور مقبولیت کی ایک اہم وجہ ہے جسمانی طاقت اور بیماریوں سے بچاؤ کے شہد کے 10 حیرت انگیز فوائد درج ذیل ہیں۔

خوبصورت اور دلکش جلد:

شہد کئی خواتین کی چمکتی اور صحت مند جلد کا راز ہے۔ اسے قدرتی موئسچرائزر، ایکسفولیئٹ اور اینٹی ایجنگ ایجنٹ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ شہد کو کئی جلدی نگہداشت کی مصنوعات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ شہد کے استعمال سے جلد صاف شفاف، ملائم اور چمکدار ہو جاتی ہے۔ یہ سورج کی خطرناک UV شعاعوں سے جلد کی حفاظت کرتا ہے اور خشک اور بے رونق جلد کو تازہ دم کر دیتا ہے۔

کیل، مہاسوں سے بچاؤ:

کیل مہاسے محض چہرے پر ہی نہیں بلکہ جسم کے دیگر حساس حصوں پر بھی نکل آتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے شہد کا استعمال بے انتہاء مفید ہے۔ شہد جلد کے تباہ خلیے اور ان میں موجود میل کچیل کو ختم کر کے جلد کو تروتازہ کرتا ہے۔ شہد ایک زبردست اینٹی سیپٹک ہے جو جلد کی آلودگی سے بھی محفوظ رکھتا ہے جو کہ کیل مہاسوں کی ایک اہم وجہ ہے۔

مضبوط اور صحت مند بال:

موسم کے باعث رکھے اور بے رونق ہو جانے والے بالوں کے لیے شہد ایک بہترین غذا اور علاج ہے۔ یہ خشکی دور کرتا ہے اور بالوں میں نمی برقرار رکھتی ہے۔ اکثر بال دھونے کے بعد خشک ہو جاتے ہیں لیکن شہد کا استعمال انہیں نرم و ملائم رکھتا ہے۔ شہد سے بالوں کا رنگ بھی زیادہ عرصے تک برقرار رہتا ہے۔ سفید اور گرتے بالوں کے لیے شہد کا استعمال بے انتہاء مفید ہے۔ جو لوگ بالوں پر رنگ کرتے ہیں ان کے لیے بھی شہد کا استعمال بے حد ضروری ہے۔ یہ نقصان دہ کیمیکل کا مقابلہ کر کے بالوں کو ان کی اصل شکل میں برقرار رکھتا ہے۔

چمکدار آنکھیں:

حیرت انگیز طور پر مصریوں کا یہ ماننا تھا کہ شہد کے ذریعے آنکھوں کی کئی بیماریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ آنکھوں پر شہد لگانے سے نہ صرف آنکھیں محفوظ رہتی ہیں بلکہ بینائی بھی تیز ہوتی ہے۔ کمزور بینائی رکھنے

والے لوگوں کے لیے بھی شہد انتہائی مفید ہے۔ اس سے آنکھوں کا انفیکشن ، آنکھوں کا لال ہوجانا اور آشوب چشم جیسی تکالیف پر بھی قابو پایا جاسکتا ہے۔ ذیابیطس کے مریضوں کو موتیا اور گلوکوما جیسے امراض سے بچنے کے لیے شہد کا استعمال کرنا چاہیے۔

ذیابیطس پر قابو پانے کے لیے:

شہد قدرتی شکر حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے اس لیے اسے سفید شکر کی جگہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ شہد نہ صرف جسم کو توانا رکھتا ہے بلکہ یہ سفید شکر کی طرح نقصان دہ بھی نہیں ہے ۔ البتہ ذیابیطس کے مریضوں کو اعتدال میں رہ کر شہد کا استعمال کرنا چاہیے اور اسے استعمال کرتے ہوئے اپنے شوگر لیول کو مانیٹر کرتے رہنا چاہیے۔

امراض قلب کے خطرات کو کم کرتا ہے:

شہد استعمال کرنے سے کولیسٹرول پر قابو رکھا جاسکتا ہے۔ شہد خون میں ایچ ڈی ایل یعنی گڈ کولیسٹرول کو بڑھاتا ہے۔ شہد کے اندر موجود ایکس پیکٹورینٹ اور سوتھنگ جیسی خوبیاں نظام تنفس کے انفیکشن سے بچاؤ کے لیے مفید ہیں۔ پانی میں شہد اور الائچی ڈال کر اُبال لیں اور اسے روزانہ استعمال کریں۔ اس مکسچر کے استعمال سے کولیسٹرول 10 فیصد تک کم ہوجاتا ہے۔

موٹاپا کم کرنے کے لیے:

یوں تو محض شہد کے استعمال سے موٹاپے پر قابو نہیں پایا جاسکتا اور اس کے لیے معتدل غذا ، مناسب ورزش اور طرز زندگی کو بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ یہ ایک بہترین ڈیٹوکس ایجنٹ ہے جس سے وزن کم کرنے میں کافی حد تک مدد مل سکتی ہے۔ اس کے استعمال سے جگر کی صفائی ہوجاتی ہے اور جگر میں موجود غیر ضروری چربی بھی اپنے آپ ہی گھل جاتی ہے۔ اس سے نظام استحالہ بہتر ہوتا ہے اور یہ نظام ہاضمہ کے لیے بھی مفید ہے۔

نہار منہ شہد کو گرم پانی اور لیموں کے ساتھ استعمال کرنا وزن کم کرنے کے لیے بے حد مفید ہے۔ البتہ یاد رہے کہ ایک چمچ شہد میں 63 کیلوریز ہوتی ہیں اس لیے اسے اعتدال میں رہ کر ہی استعمال کرنا چاہیے۔ البتہ یقینی طور پر شہد کو سفید شکر کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ شہد کا تھوڑی مقدار میں استعمال بھی چینی کی کمی کو پورا کر دیتا ہے اور یہ نقصان دہ بھی نہیں ہے۔ اسے چائے میں ڈال کر پینے سے نہ صرف چائے کا ذائقہ مزید اچھا ہوجاتا ہے بلکہ اس سے چائے کی افادیت میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔

دافع جراثیم:

شہد ایک اینٹی بیکٹیریل اور اینٹی آکسیڈنٹ ہونے کی وجہ سے جسم کا دفاعی میکانیزم مضبوط کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جس کے باعث شہد کا استعمال کرنے والے لوگ سردی، فلو اور الرجیز سے بچے رہتے ہیں۔

سینے اور گلے کا انفیکشن:

سینے اور گلے کے انفیکشن سے بچاؤ کے لیے دو بڑے چمچ شہد کا سونے سے قبل استعمال انتہائی مفید ہے اس سے گلے کی سوزش کم ہوتی ہے اور آرام پہنچتا ہے۔ ساتھ ہی اس سے نیند بھی اچھی آتی ہے۔ الرجی اور گلے کے انفیکشن سے بچاؤ کے لیے چائے میں شہد ڈال کر پینا چاہیے۔

بہترین اینٹی بیکٹیریل:

شہد کی ایک اہم خصوصیت اور افادیت یہ بھی ہے کہ اس سے زخم جلد بھر جاتا ہے۔ دودھ پلانے والی خواتین کے لیے شہد کا استعمال بہت مفید ہے اس کے استعمال سے چھاتی کے انفیکشن پر قابو پایا جاسکتا ہے اور یہ ایک بہترین پین کلر بھی ہے۔ دودھ پلانے والی خواتین شہد کو بطور دوا اور بطور مرہم استعمال سے ہر قسم کے بیکٹیریاز سے خود کو اور اپنے بچے کو محفوظ رکھ سکتی ہیں۔

غرض یہ کہ انسان کے لیے شہد کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ پانی، چائے اور میٹھے کے ساتھ شہد کے روزانہ استعمال سے نہ صرف اس کا ذائقہ بڑھایا جاسکتا ہے بلکہ اس سے جسمانی و ذہنی توانائی بھی بڑھائی جاسکتی ہے۔

(بحوالہ از: www.kfoods.com)

تاثرات: نگر نگر سے

خواتین دنیا برابر موصول ہو رہا ہے۔ آپ نے میری دو تحریروں ''وارث'' اور ''گھر کا چراغ'' کو خاتون دنیا میں جگہ دی اس کے لیے شکریہ ادا کرتی ہوں میں مختصراً اپنا تعارف پیش کرنا چاہتی ہوں۔ میرے ہاتھ میں 1952 سے قلم ہے۔ پہلی کہانی ''ماں'' لکھی تھی جو پاکستان کے رسالے ''نقاد'' میں شائع ہوئی۔ سلسلہ چلتا رہا اور افسانے مضامین، تاریخی و تحقیقی و تنقیدی مضامین ملک کے موقر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ تقریباً دو سو سے زائد افسانے اور دس ناول احاطہ تحریر میں آ چکے ہیں۔ رام پور کی ادبی فضا اور مسلم یونیورسٹی کی تعلیم اور خدا تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیت میری معاون ہوئیں۔ سال گذشتہ قومی اردو کونسل نے میرے ناول ماہ پیکر کو قبولیت کی سند عطا کر کے چالیس جلدیں خرید لیں۔ امسال بھی ایک اصلاحی ''ناول'' لال حویلی بھیجا ہوا ہے۔ رامپور رضا لائبریری کے جنرل میں بھی کافی تاریخی مضامین جگہ بنا چکے ہیں غالباً آپ کی نظر سے بھی گزرے ہوں جس نے کوئی افسانہ ناول یا مضمون وقتی تفریح کے لیے نہیں لکھا۔ معاشرے کی اصلاح میرا مشن ہے اب عمر کے آخری اسٹیج پر یعنی 80 سال کی عمر ہو چکی۔

خلیق النسا، مزار ناث شاہ میاں، رامپور، یوپی

''خواتین دنیا'' نومبر 2019 باصرہ نواز ہوا۔ فروغ اردو کے لیے، یہ شمارہ آفتاب کی مانند ہے، جس کے ذریعہ اردو کی سنہری کرنیں سبھی طرف بکھیر رہی ہیں، سرورق سے آخری صفحہ تک ''خواتین دنیا'' کو ادبی گلدان بنانے میں ادارے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ادارتی صلاحیت ہر ماہ کے شمارے میں جھلکتی ہے، (ص5) سے (8) پر ''گرو نانک دیو جی'' سے منسلک جو مضمون شائع ہوا ہے جو کافی معلوماتی ہے، (ص8) پر جناب حقانی القاسمی صاحب کی شبنم عشائی صاحبہ سے گفتگو بڑے موثر انداز میں ہوئی ہے، جس میں شبنم صاحبہ نے دور حاضر کی عورتوں کو ''کچلا ہوا خواب'' بتانے میں گریز نہیں کیا ہے، شبنم صاحبہ کا جملہ ''عورت خود اپنی نسوانیت کی بن سکتی ہے'' قابل قدر ہے، (ص12) سے (ص13) پر ''ڈاکٹر کامنی ورما'' کا لکھا مضمون تحریک آزادی میں عورتوں کی خدمات کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی خواتین جس میں نسوانی حسن کے ساتھ ایک ایسی خوبی بھی موجود ہے جو اسے پھول سے چنگاری بنا سکتی ہے، کامنی ورما جی کا یہ مضمون قابل ستائش ہے۔ (ص19) پر ''ڈاکٹر مسرت جہاں صاحبہ'' کے زیر قلم انجام پایا مضمون تعریف کے لائق ہے، ''فریاد داغ'' کو انھوں نے کچھ جس انداز میں پیش کیا ہے، اس کے ذریعہ ''داغ دہلوی'' کی زندگی کے کئی واقعات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، ''ڈاکٹر مسرت جہاں صاحبہ'' کو اس مضمون

کے لیے مبارک باد پیش کرتی ہوں، دیگر مضامین بھی قابل تعریف ہیں، ڈاکٹر محمد طالب اطہر انصاری صاحب کا لکھا مضمون اپنا جواب نہیں رکھتا، آج جس طرح والدین بچوں سے دور ہو رہے ہیں، اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ رہے ہیں، اس مضمون کے ذریعہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ پائیں گے، اور بچوں سے ان کی قربت بڑھے گی، نومبر کے شمارے میں شائع ہوئی ساری کہانیاں بہت عمدہ ہے، شمشاد بیگم صاحبہ اور فوزیہ رباب صاحبہ کی غزلیں بھی عمدہ ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ''خواتین دنیا'' خوب ترقی کرے۔ آمین

زینت جبین صدیقی، اولڈ پورولیہ روڈ (ویسٹ) ذاکر نگر، مانگو، جمشید پور، جارکھنڈ

ماہنامہ 'خواتین دنیا' نومبر 2019 نظر نواز ہوا۔ خواتین کے لیے بھی کوئی مخصوص رسالہ نکلے، اس کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جاتی رہی ہے۔ ایسے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جیسے ادارے نے اس کی کمی بہت حد تک دور کردی ہے۔ محض 10/روپے میں بے حد معلوماتی، دیدہ زیب اور رنگین تصاویر سے آراستہ ایسا رسالہ شاذونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس رسالہ میں صرف خواتین قلمکار ہی لکھ سکتی ہیں یا مرد قلمکار صرف اور صرف خواتین ادیبوں پر ہی لکھ سکتے ہیں یا اس رسالہ کے موضوعات صرف خواتین پر ہی مرکوز ہوں گے؟ جی نہیں، ایسی کوئی بندش یا ایسا کوئی فیصلہ نہیں صادر کیا گیا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مختلف النوع قسم کے موضوعات اس رسالہ کی زینت بنتے ہیں۔ ان میں شخصیات، انٹرویو، شاعرات کا کلام، افسانے، مضامین، باورچی خانہ (پکوان)، آرائش و زیبائش، قارئین کے خطوط اور خبرنامے وغیرہ شامل ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت بھی ہے۔ اداریہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت پر لکھا گیا ہے۔ چونکہ اس شمارہ میں مولانا آزاد پر ایک بھی مضمون شامل نہیں ہے ایسے میں یہ اداریہ اس تشنگی کو دور کرتا نظر آتا ہے۔ بہر کیف! اس شمارہ کے مشمولات اس کمی کو دور کرتے ہیں۔ شخصیات کے کالم میں گرونانک جی پر مضمون مختصر مگر معلوماتی ہے۔ مرد و زن میں مساوات پر گرونانک دیو جی زور دیتے تھے۔ خواجہ عبدالمنتقم کا بے حد شکریہ کہ انھوں نے گرونانک جی کی شخصیت کے اس عنصر کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی۔ حقانی القاسمی کا شبنم عشائی سے انٹرویو عمدہ ہے۔ 'روبرو' کے تحت انٹرویو کا یہ سلسلہ اس شمارہ کی اصل جان ہے۔ 'جہانِ نسواں' کے تحت شائع سارے مضامین اہم اور معلوماتی ہیں، جن میں 'سول نافرمانی کی تحریک میں خواتین کا رول' کامنی ورما، 'فریادِ داغ اور داغ دہلوی' از ڈاکٹر مسرت جہاں، 'مہ لقا چندا: دکن کی اولین نسائی آواز' از ڈاکٹر شیخ ریحانہ بیگم، اور 'لیلی کے خطوط' کے حوالے سے ڈاکٹر مسرّت کا مضمون اہم اور خاص ہے تمام مضامین عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں۔ اس شمارے میں شامل تینوں کہانیاں بھی عمدہ ہیں۔ شمشاد بیگم سنبل اور فوزیہ رباب صاحبہ کی غزلیں اچھی ہیں۔ صحت کے حوالے سے آیوڈین کی اہمیت و افادیت پر عظیم اقبال صاحب کا مضمون معلوماتی ہے۔ 'خواتین خبرنامہ' کے تحت مالیگاؤں کی سمیہ انصاری کی کامیابیوں کی خبر سے آشنائی ہوئی۔ خدا انھیں مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ (آمین) مختصر یہ کہ زیرِ نظر شمارہ ان ساری خوبیوں سے مزین ہے جس کی روشنی میں ہم 'خواتین دنیا' کو نہ صرف ایک مکمل خواتین کا رسالہ کہہ سکتے ہیں بلکہ اسے ایک تحریکِ نسواں سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ یقیناً اس کی کامیابی کا سہرا مدیران کے سر جاتا ہے کہ جن کی محنت و ریاضت سے اس رسالہ کو مقبولیت ملی ہے۔ امید ہے مستقبل میں بھی 'خواتین دنیا' اپنی رمق دمق قائم رکھے گا اور اپنی ایک منفرد شناخت بنائے رکھے گا۔

جاوید اختر، اسسٹنٹ ٹیچر (اردو)، گورنمنٹ پرائمری اسکول، دربھنگہ، بہار

'خواتین دنیا' اپنے آغاز سے ہی میرے مطالعے میں ہے۔ اردو زبان میں اس طرح کے رنگین اور معلوماتی ادبی رسالے کی کمی برسوں سے محسوس کی جارہی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس رسالے کی شکل میں خواتین کو ایک خوبصورت تحفہ عنایت کیا ہے۔ تازہ شمارہ بھی بیحد معیاری ہے اور اس شمارے کی کہانیوں نے بہت متاثر کیا۔ جامعہ کی وائس چانسلر سے انٹرویو بھی اس شمارے کی معنویت میں اضافہ کر رہا ہے۔ جامعہ کے قیام کو سو برس گزر چکے ہیں اور آج پروردہ تعلیم و تربیت کے میدان میں اپنی ایک مستحکم شناخت رکھتا ہے۔ 'آئین سازی میں خواتین کا کردار'، 'جنسی استحصال کا معروضی جائزہ' اور 'مرد و عورت کے مابین تفریق کیوں' جیسے مضامین لائق مطالعہ ہیں اور ایسے معلوماتی مضامین کی اشاعت ضرور کریں جن سے خواتین میں بیداری پیدا ہو۔

غزالہ گلزار، رفیع احمد قدوائی، کولکاتا، مغربی بنگال

□□□

خواتین خبرنامہ

میری کوم نے پنجاب کو دلائی فتح
بگ باٹ باکسنگ لیگ

7 دسمبر 2019، روزنامہ سہارا (گریٹر وئیڈا (یو این آئی)۔ چھ بار کی عالمی چیمپئن ایم سی میری کوم نے جمعرات کی رات بگ باؤٹ باکسنگ لیگ میں اپنی ٹیم پنجاب پینتھرز کو یہاں گوتم بدھ یونیورسٹی انڈور اسٹیڈیم

میں کھیلے گئے میچ میں بامبے بلیٹ کے خلاف 2-5 سے جیت دلا دی۔ میری کوم نے ریو اولمپک 2016 کا نسے کا تمغہ فاتح انگرِیڈ لورینا کو 0-5 سے شکست دے کر اپنی ٹیم کی جیت کو یقینی کیا۔ منوج کمار کی شکست نے پنجاب کو دھکا پہنچا دیا تھا، لیکن میری کوم نے ٹیم کو سنبھال لیا۔ مردوں کے 69 کلوگرام وزن زمرہ کے مقابلے میں بامبے کے نوین بورا نے منوج کو 1-4 سے شکست دی۔ اس کے بعد دونوں ٹیموں کی کپتانوں کا میچ دلچسپ بن گیا جہاں میری کوم مقابلہ جیتنے میں کامیاب رہیں۔ اس سے پہلے، عبدالمالک کھالا کو داوری ایل پرساد نے پنجاب کو شاندار شروعات دلائی۔ یوتھ اولمپک چیمپئن عبدالمالک نے مردوں کے 57 کلوگرام وزن زمرہ میں ایشیائی کھیلوں کے سلور میڈلسٹ کوندر بشٹ کو شکست دی۔ پہلے راؤنڈ سے ہی انھوں نے اپنی بادشاہت قائم رکھی۔ 19 سال کے کھلاڑی نے بائیں ہک سے بامبے کے باکسر پر باثر حملہ کیا۔ اسی وجہ سے دوسرے راؤنڈ میں ریفری کو اسٹینڈنگ کاؤنٹ کرنا پڑا ہے۔ پرساد اڑیسہ واریرس کے خلاف کھیلے گئے ٹیم کے پہلے میچ میں اپنا مقابلہ ہار گئے تھے۔ اس بار انھوں نے واپسی کی اور احت چوپاڑے کو شکست دی۔ جس اعتماد سے انھوں نے اپنی تیزی اور مستعدی کا ثبوت دیا اس سے ان کے حریف کے پاس زیادہ کچھ کرنے کو بچا نہیں۔ اس کے بعد اگلے میچ میں منیشا نے خاتون کے 60 کلوگرام وزن زمرہ میں بامبے کی میلیسا ناوی کو شکست دے کر میچ کا رخ پنجاب کی طرف موڑے رکھا۔ اس کے بعد پنجاب کے نوین کمار نے بامبے کے امینو ریاس کو مردوں کے 91 کلوگرام وزن زمرہ میں 2-3 سے ہرا دیا۔ پریاگ چوہان نے مردوں کے 75 کلوگرام وزن زمرہ میں پنجاب کے موہت کو مات دے کر بامبے کے اکاؤنٹ میں دوسرا پوائنٹس ڈالا۔ پنجاب کی کپتان میری کوم نے ٹاس جیتا اور یوتھ خاتون 57 کلوگرام

وزن زمرہ کے مقابلے کو بلاک کر دیا۔ یہاں پنجاب کی طرف سے سپنا شرما کو اترنا تھا لیکن وہ اڑیسہ کے خلاف کھیلے گئے پہلے میچ میں ہار گئی تھیں۔ سپنا کا سامنا نیشنل یوتھ رنر اپ پریا کشواہا سے ہونا تھا۔

ویٹ لفٹر راکھی نے قطر انٹرنیشنل کپ میں جیتا کانسے، بنائے دو نئے راشٹریہ ریکارڈ

24 دسمبر 2019 (امر اجالا)۔ ہندوستانی قانونی ویٹ لفٹر راکھی ہلدر (64 kg) نے قطر انٹرنیشنل کپ میں کانسے کا تمغہ جیتنے کے ساتھ دو نئے قومی ریکارڈ بھی بنائے۔ دولت مشترکہ چمپئن شپ نے اسنیچ اور کل وزن میں اپنے ہی بہترین کارکردگی میں بہتری کی۔ انھوں نے اسنیچ میں 15 کلو گرام کے ساتھ کل 218 کلوگرام وزن اٹھایا۔ دولت مشترکہ چمپئن شپ میں راکھی نے 214 کلوگرام (94 کلوگرام + 120 کلوگرام) وزن اٹھا کر پہلا تمغہ جیتا تھا۔ ہندوستانی کھلاڑیوں نے رجت سطح کی اس اولمپک کوالی فائنگ مقابلے میں کل تین تمغوں کے ساتھ اپنی مہم ختم کی۔ سابق چمپئن شپ میرابائی چانو نے سونے کا جبکہ نوجوان جیریمی لال رنوگا نے چاندی کا تمغہ جیتا تھا۔ اس ٹورنامنٹ کے پوائنٹس 2020 ٹوکیو اولمپک کے لیے لسٹ تیار کرتے وقت کافی اہم ہوں گے۔

اولمپک کوالیفائی کرنے کے لیے ایک ویٹ لفٹر کو چھ مہینے کے تین دور میں (نومبر 2018 سے اپریل 2020 تک) میں سے ہر ایک میں کم سے کم ایک مقابلہ اور کل چھ مقابلوں میں حصہ لیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی کھلاڑی کو کم از کم ایک گولڈ اور ایک الگ چاندی لیول کے مقابلوں میں حصہ لینا ہوگا۔

لوگوں کی حمایت سے اعتماد بڑھا: پرومیلا

26 دسمبر، 2019 ہمارا سماج۔ گواہاٹی، 25 دسمبر (یو این آئی)

بھارت کی اہم خاتون تیر اندازوں میں سے ایک اور تیر اندازی ایشیا کپ 2018 کی طلائی تمغہ یافتہ پرومیلا ڈیماری نے بدھ کو کہا کہ آسام کے لوگوں کی حمایت سے ان کا اعتماد کافی بڑھا ہے۔ شمال مشرق میں آسام کے ادل گوری گاؤں سے تعلق رکھنے والی ڈیماری نے کھیلو انڈیا یوتھ گیمس کے تیسرے ایڈیشن میں آسام کے چمپئن بننے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ یہ کھیل اگلے برس دس سے 22 جنوری تک ہوں گے۔ ڈیماری نے کہا کہ جب مجھے پتہ چلا کہ آسام کے لوگ کھیل پر میری بہت حمایت کرتے ہیں تو اس

سے میرا اعتماد کافی بڑھا۔ میں امید کرتی ہوں کہ کھیلو انڈیا یوتھ گیمس کے تیسرے ایڈیشن کا چمپئن آسام بنے۔ آسام میں ٹورنامنٹ میں حصہ لے رہے کھلاڑیوں کو میں اپنی حمایت دینا چاہوں گی۔ اس ٹورنامنٹ میں کھلاڑیوں کو زیادہ سے زیادہ تمغے جیتنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ 22 سالہ تیر انداز اس برس ہوئے برلن اور انا طولیہ عالمی کپ میں چوٹی کے دس کھلاڑیوں میں شامل تھیں۔ انھوں نے اپنا پہلا بین الاقوامی ٹورنامنٹ 2012 میں کھیلا تھا۔ ڈیماری نے 2016 میں پہلی بار بھارت کی نمائندگی کی تھی۔ انھوں نے کھیلو انڈیا یوتھ گیمس پہل کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ نوجوان کھلاڑیوں کے لیے بڑا ٹورنامنٹ ہے اور اپنی صلاحیت دکھانے کے لیے ایک شاندار پلیٹ فارم ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تفہیمات وترجیحات

مصنف: شیخ عقیل احمد

صفحات: 237

قیمت: 130 روپے

اردو زبان وادب پر عربی کے اثرات

مصنف: ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

مترجم: محمد طارق

صفحات: 507

قیمت: 225 روپے

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

قومی تہذیب کا مسئلہ

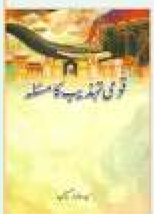

مصنف: سید عابد حسین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 220

قیمت: 120 روپے

کلیاتِ سراج

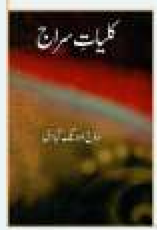

مصنف: سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 732

قیمت: 320 روپے

اردو املا

مصنف: رشید حسن خاں

پانچویں طباعت: 2019

صفحات: 706

قیمت: 240 روپے

تذکرہ شعرائے رام پور

فارسی تصنیف: جارج فانتوم متخلص بہ صاحب وجرجیس

اردو ترجمہ وحواشی: مصباح احمد صدیقی

صفحات: 123، قیمت: 90 روپے

خودنوشت سوانح عمری: شیخ علی حزیں لاہجی

ترجمہ وتقدیم: ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی

صفحات: 136

قیمت: 85 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly January 2020, Vol. 4, Issue: 1
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025